صوفیہ بٹ

الحمد

یہ کہانی ہے ایک لڑکی اجل کے عشق کی۔ ایسا عشق جس نے اسے دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ عشق جو ہر شے سے ماورا ہے۔

رحیمہ احمد ایک بڑی حویلی کی بڑی بہو ہیں۔ لیکن قدرت نے انہیں اولاد سے محروم رکھا ہے۔ وہ اپنے دیور اور نند کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھتی ہیں، حویلی کا سارا انتظام انہوں نے سنبھال رکھا ہے۔ وہ ایک بچی کو یاد کرتی رہتی ہیں جو ان کی زندگی میں کچھ وقت کے لیے آئی تھی۔ گھر میں اتنے افراد ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کرتی ہیں۔ اس گھر میں ان کے تین دیور رہتے ہیں چوہدری حیدر یعقوب اور ان کی بیوی رفعت جہاں ان کے چار بچے ہیں۔ یاسر.....اسود.....فاطمہ اور مومنہ۔

یاسر ایم کام کے بعد بینک میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس کی بات اپنی پھوپھی کی بیٹی رباب کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ اس سے چھوٹا اسود سندھ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا ہے۔ تیسرے نمبر کی فاطمہ تھی اس کی منگنی خالہ زاد خرم سے ہو چکی ہے۔ وہ جرمنی میں ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹی مومنہ جو یونیورسٹی میں جانا چاہتی تھی اجازت نہ ملنے پر کالج میں بھی داخلہ نہیں لیا تھا۔

چوہدری سلیمان یعقوب اور آسیہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ہمایوں بی کام کے بعد باپ دادا کی زمینیں سنبھال رہا ہے جبکہ بیٹا بابر فرسٹ ایئر میں اور بیٹی گل چہرہ نہم میں تھی۔

سب سے چھوٹے دیور چوہدری سفیان یعقوب اور دیورانی ارم کی دو بیٹیاں چار سال کی عروہ اور ساڑھے تین سال کی حبہ تھی اور ولی۔

ان کی دو نندیں تھیں۔ فردوس اور یاسمین، یاسمین شہر میں رہتی جبکہ آپا فردوس ان کے گھر کے برابر میں ایک

مکمل ناول

www.zemtime.com
ZEMTime SINCE 2014

دیوار پیچھے رہتی تھیں۔ ان کے پانچ بچے تھے ـــــ مظہر، اطہر اور طاہر بیٹے اور رباب، مہرتاب بیٹیاں تھیں۔

اسود رحیمہ احمد کو بہت پیارا تھا۔ انہوں نے اس سے ایک وعدہ لے رکھا ہے۔

مہرتاب اسود میں دلچسپی لیتی ہے اور ہمایوں مومنہ کو چاہتا ہے جو بہت نخریلی ہے۔

وہ پڑھنے کے لیے سندھ یونیورسٹی آرہی تھی تو بھاؤ نے اس کی پہرے داری کے لیے پہلے ہی انتظامات کر دیے تھے۔ امر کو بھی جو اس کو پرستش کی حد تک چاہتا تھا اس کے لیے اس نے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لینے پر مجبور کیا گیا۔

ایک لڑکی اس کا نام پوچھتی ہے تو وہ بتاتی ہے درگاہ دیوی۔

دوسری قسط

امتل

گنگا نے ہاتھ میں پکڑا ٹماٹر چھلی میں ڈالا اور نہر کی جانب آس بھری نظروں سے دیکھا جس دن جس پل رامو اس نہر کے کنارے کنارے چلتا نظروں سے اوجھل ہوتا تھا، اس کی بے قرار مچلتی تھرکتی نگاہیں جیسے اپنی پشت پر سے ہٹا کر یہیں گاڑ جاتا تھا اور اس کی جان ساتھ لے جاتا تھا۔

مالکوں کی زمینوں کی پیاس اپنے خون پسینے سے بجھاتے ہوئے، پانی کے بھاری برتن سر پہ ٹکائے ڈولتے قدموں سے پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے، کانپتے لرزتے ہاتھوں سے درانتی چلا چلا کر بکریوں کی خوراک کا بندوبست کرتے ہوئے، گھر کے اندر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے کانٹوں بھری جھاڑیوں کی باڑھ کے عقب سے بھی یہ نگاہیں اسی نہر کنارے کی سیر کرتی رہتیں۔

"آج بھی نہیں آیا۔ خبر کل آجائے۔" اپنے جی کو آسرا دیتے ہوئے سامنے والے پودے کی طرف متوجہ ہوئی جس کے سینے پہ کئی ٹماٹر تمغوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اس نے جی کڑا کر کے انہیں توڑنا شروع کر دیا۔

وہ عجیب عورت تھی جب کسی پھل پھول کو کھینچ کر ان کی جنم بھومی سے الگ کرتی اس کے دل میں خنجر ہی تو کھب جاتا۔ اسے لگتا، اس کے رامو کو زبردستی اس سے کھینچ کر جدا کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ خوب جانتی تھی کہ ان کے مقدر میں تو ہے ہی اپنی جڑوں، اپنے اصل سے جدائی۔

"گنگا! ابھی تیری یہ چھلی نہیں بھری؟" کملا کے تعجب سے کہنے پہ اس کے ہاتھوں میں تیزی آگئی۔ نہر پہ بے بس سی نگاہ ڈال کر پودے پہ مزید جھک گئی۔

دور تک نگاہ میں ٹماٹروں کے کھیت ہی کھیت تھے۔ جس میں کتنے ہی ہرے پیلے، سرخ آنچل لہرا رہے تھے جو اس گاؤں کی کولہی اور بھیل عورتوں کے تھے۔ ان کا لباس گھاگرا چولی تھا۔ ان کی اوڑھنی کا ایک سرا گھاگرے کے نیفے میں اٹکایا گیا تھا جبکہ دوسرا پشت پر سے ہو کر ان کے سر پہ یوں سج جاتا کہ گھونگھٹ سا بن جاتا۔ کئی عورتوں اور لڑکیوں نے اس گھونگھٹ کو ایک طرف سے کھینچ کر دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ ذرا جو ہوا جھوم کر آتی، یہ آنچل یوں ادھر سے ادھر لہراتا کہ ان کی محض چند ڈوریوں سے بجی برہنہ پشت ایسی جھلک دکھاتی کہ دیکھنے والا اگر اپنی نگاہیں جھکا پاتا تو بڑا ہی مومن ٹھہرتا۔ ان کے بازو کلائیوں سے لے کر آخر تک پلاسٹک کی سفید چوڑی سی چوڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جن کو قریب سے دیکھنے پہ کسی کا کنارا سلور ملتا تو کسی کی چوڑیوں پہ ہلکے رنگوں کے گل بوٹے بھی ملتے۔ کچھ بازو کلائی سے لے کر محض کہنی تک ہی اس زیور سے آراستہ تھے۔ یہ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے بازو تھے تاہم ان کی تعداد بہت کم تھی۔

ان کے بدن پہ سجا باقی زیور تو سمجھو غلامی کا پورا سامان۔ موٹی بھاری نتھ جیسے لگام، گردن سے بالکل جڑا ٹھوس وزنی ہار جیسے کوئی طوق، پاؤں میں جھانجھر

www.zemtime.com

کے نام پہ بیڑیاں۔ اکثر نے نتھ نتھنوں کے بیچ والے حصے میں پہن رکھی تھی۔ ان زیوارت کے بوجھ سے ان کے کان اور ناک کے سوراخ اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ چھوٹے بچے کی انگلی آرام سے ان میں سے گزر سکتی تھی۔ چاندی کے ان ٹھوس بھاری زیورات سے نزاکت کہیں سے نہ جھلکتی تھی۔ دیکھنے والے کو یہ محض ایک بوجھ محسوس ہوتے۔ پر یہ عورتیں ان کے بغیر اپنے آپ کو بالکل ادھورا محسوس کرتیں۔

چند کھیت پرے گہرے گلابی رنگ کے لباس میں تمتماتے رخساروں والی کاجل بھرے نینوں والی ایک لڑکی کی نگاہیں بھی بھٹک بھٹک کر اسی نہر کی طرف جاتیں۔ رامو کیا جانتا، مانو اس کا سکھ چین ساتھ لے جاتا۔

"کِنا (گندا) خبر کدھر چلا جاتا ہے۔ جو ہماری سک (یاد) ہی نہیں لگتی۔ چل کبھی تو آئے گا ناں۔"

دل ہی دل میں اس سے باتیں کرتے ہوئے شکوے کرتے ہوئے اور پھر نئی آس لگاتے ہوئے نگاہوں سے نہر کا بار بار طواف کرتے وہ تیزی سے چھلیاں بھی بھرتی جا رہی تھی۔

بھوک کا احساس جاگا تو اس نے مخملیں سرخ ٹماٹر توڑا اور وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ٹماٹر پہ لگی مٹی اس ہاتھ سے صاف کی جو پہلے ہی مٹی سے سرمئی ہو رہے تھے۔ اس پہ اپنے موتیوں جیسے سفید چمکیلے دانت پیوست کر دیے۔ اب وہ پوری توجہ کے ساتھ کھا سکتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بغیر پلکیں جھپکائے نہر کی طرف دیکھ سکتی تھی۔

اس کھیت میں جو عورتیں پودوں پہ جھکی نظر آ رہی تھیں۔ ان کا لباس دوپٹے کے ساتھ لمبی قمیصوں کو چھوتی قمیص اور کھلے پائنچوں والی شلواریں تھیں۔ یہ اس گاؤں کی مسلمان عورتیں تھیں۔ لباس کے فرق کے علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا رہن سہن، زبان، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ کچھ خاص الگ نہ تھے۔ ہاں..... سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ مسلمان اللہ اللہ کرتے اور ہندو رام رام۔ اس سے زیادہ دین دھرم سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ گوٹھ کی مسجد میں اگر چند لوگ باجماعت نماز ادا کرنے پہنچ جاتے تو اس میں ان کے ماں باپ کی دین سے متعلق تعلیم یا اس کے مطابق تربیت کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہ اس مسجد کے امام صاحب کی مخلص کوششیں تھیں۔ ورنہ تو اکثر ایسے تھے کلمے قرآن کا ذکر چلتا تو سامنے والے کو یوں تکتے جیسے وہ کوئی اور ہی بولی بول رہا ہے۔ بہر حال کچھ اور ہو نہ ہو ان کے اندر یہ احساس برتری ضرور سانس لیتا کہ ان کا دین بھی وہی ہے جو ان کے مالکوں کا ہے۔ اور مالکوں کی مساوات کا عالم یہ کہ مسلم ہو یا ہندو، انسان ہو یا جانور، غلام ہو یا جیت (کیڑے مکوڑے)، سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے۔

☆☆☆

اگلے دن اس کی نگاہیں اسود کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتی رہیں۔ عمر کوٹ کے محل سے نکل کر یہاں بھی جو اپنے آپ کو پابجولاں پائی تھی، کل سے لگ رہا تھا کہ پابند سلاسل تو اب بھی تھی مگر قید خانے کی دیواریں جالی دار ہو گئی ہیں، ان میں کھڑکیاں دروازے لگ گئے ہیں۔

اس نے خوابوں میں تو ایسے منظر دیکھے تھے، خیالوں میں تو یہ پل جیے تھے مگر حقیقت میں وہ چوہدری نگر کے سرمئی رنگ کے بڑے سے گیٹ والے گھر کے کسی باسی سے مل پائے گی، ایسا سوچنا چھوڑ دیا تھا اور اب جب وہ اسود سے مل لی تو کسی پل چین نہ تھا۔ وہ پھر اس سے ملنا چاہتی تھی، اسے دیکھنا چاہتی تھی، کتنی باتیں تھیں جو اس سے پوچھنی تھیں، کتنی باتیں تھیں جو اسے بتانی تھیں۔ مگر وہ اسے نظر نہ آیا تھا۔ تین دن تک جب ایسا ہی ہوا تو وہ مزید صبر نہ کر سکی اور کلاسز اٹینڈ کرتے ہی آئی بی اے آ گئی۔

وہ اسے سامنے ہی اپنے دوستوں کے بیچ کھڑا نظر آ گیا۔ وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی پھر جھجک کر رک گئی۔ اسود نے اسے دیکھ لیا تھا دوستوں سے معذرت کر کے اس کی طرف آ گیا۔

www.zemtime.com

"کہاں تھے تم؟ پھر آئے کیوں نہیں؟" اسود کے قریب پہنچتے ہی اس نے شکوہ کیا۔

"مجھے لگا کہ میرا تم سے ملنا تمہارے لیے مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے چاہ کر بھی تمہارے ڈپارٹمنٹ نہیں آیا۔"

"ہاں..... وہ اس دن مجھے امر نظر آ گیا تو میں گھبرا گئی۔ خیر، اتنی پریشانی والی بات نہیں۔"

"امر؟" اسود نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"امر..... میرا پہرے دار۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔

"پہرے دار..... اس کا مطلب ہے کہ تم پر نظر رکھی جارہی ہے یا تمہاری حفاظت کی جارہی ہے۔"

"دونوں باتیں ہیں۔ حفاظت اس لیے کی جارہی ہے کہ بھاؤ کو ڈر ہے کہ کہیں تم لوگ مجھے چرا نہ لو..... اور نظر اس لیے رکھی جارہی ہے کہ کہیں میں اپنی مرضی سے چوری نہ ہوجاؤں۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

اسود کی نگاہ کے سامنے وہ لڑکا آیا جو اچانک ہی کہیں سے نکل کر امتل کے سامنے آکھڑا ہوتا تھا۔ جس کو وہ نہایت ناگواری کے ساتھ دیکھتی تھی۔ شاید وہ اسی کی بات کررہی تھی۔

"امتل! تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔" وہ حقیقتاً اس کے لیے پریشان ہوا۔

"واپس چلی جاتی ہوں۔" وہ بگڑی۔

"میں نے یہ کب کہا..... پاگل! میں تو خود کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا تم سے..... ایک ہاسٹلر کلاس میٹ سے ریکویسٹ کی تھی کہ وہ ہاسٹل میں تمہیں ڈھونڈ کر تمہارا نمبر لے کر مجھے دے۔" وہ دھیمے لہجے میں وضاحت کرنے لگا۔ وہ اپنے تیکھے پن پہ شرمندہ سی ہوئی۔

"آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لے کر چل دیا۔

"تم نے ماں کو بتایا میرے بارے میں۔" چلتے چلتے اس نے بے تابی اور اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں..... فون پہ بتانے کا کیا مزا..... گھر جاؤں گا تو اپنے سامنے بیٹھ کر یہ خبر سناؤں گا۔ ان کے چہرے پہ بکھرتے خوشی کے رنگ دیکھوں گا۔ ان کی آنکھوں میں یقین اور بے یقینی کی جھلک دیکھوں گا۔ ان کی فوراً تمہیں دیکھنے کی بے قراری ملاحظہ کروں گا۔" وہ ان کی متوقع بلکہ یقینی کیفیات بڑے مزے سے بیان کررہا تھا۔

اس لڑکی کا جی چاہا..... وہ بھی اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

"تو پھر کب جاؤ گے چوہدری نگر؟" گہرا سانس لیتے ہوئے آکسیجن کے ساتھ اپنی حسرت کو بھی اندر ہی کھینچ ڈالا اور سینے میں دفن کرلیا۔

"ہفتے کو۔"

"کیوں..... اتنے دنوں بعد کیوں؟؟"

"چند کالج اسٹوڈنٹس کو فزکس اور کیمسٹری کی ٹیوشن دیتا ہوں۔ اسی ہفتے گھر سے آیا ہوں۔ پھر چلا گیا تو ٹیوشنز بھی چلی جائیں گی..... اب یہ خبر اتنی اہم بھی نہیں کہ اپنی کمائی پہ لات ماردوں۔" آخر میں اس کے لہجے میں شرارت آگئی۔ وہ اسے گھورنے لگی تو ہنس دیا۔

"تم بتاؤ، کیسی ہو؟ ہاسٹل میں دل لگا یا نہیں، کوئی مسئلہ....."

"چھوڑو ان باتوں کو..... یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے مجھے تم سب کے بارے میں بتاؤ۔" وہ بے تابی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے لگائے اسے اس بڑے سارے صحن اور سرمئی گیٹ والے گھر کے ہر فرد کے بارے میں بہت تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی اس کی چکنی سطح پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت پیار، بہت توجہ سے سننے لگی۔

"اسود! بابا نے مجھے یاد تو کیا ہوگا..... میرا انتظار تو کیا ہوگا؟" اس نے ایک دم پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

"ان کی نگاہیں تو آخری لمحے تک دروازے سے لگی رہیں۔ انہوں نے آخری دم تک آس نہ چھوڑی کہ ان کی بیٹی آئے گی اور ان کے ابدی سفر کو

www.zemtime.com

پرسکون بنا دے گی۔" بہت ضبط کے باوجود اسود کا لہجہ بھیگنے لگا۔

اسے یوں لگا جیسے بابا کی میت اس کے سامنے رکھی ہو۔ وہ ان کا دیدار کر رہی ہو۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ سامنے کھڑے اس مہرباں، اس بے حد اپنے سے لگنے والے شخص کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ لیکن وہ تو دو آنسو بھی کھل کر نہ بہا سکی۔

"تم لوگ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟ میں آخری بار ان سے مل لیتی۔ ان کا ہاتھ تھام کر ان کی دعا لیتی۔ اور..... اور"

اسود نے تحیر سے اسے دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر بھینچ لیے۔

"ماں بہت اکیلی ہوں گی ناں ان کے جانے کے بعد۔" اس کی ننھی سی ٹھوڑی کپکپا رہی تھی۔ آنسو بہانے کی شدید خواہش کے پورا نہ ہونے پہ اس کی ٹھوڑی یوں ہی احتجاج کرتی تھی۔

"نہیں..... بابا ان سے کہہ کر گئے تھے کہ امت الاحد واپس آئے گی۔ یہ آس، یہ امید انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔" اسود نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ کیونکہ اس کی کانپتی ٹھوڑی اسے مضطرب کر رہی تھی۔

"ماں اور بابا کی یہ امید پوری ہوگی ناں اسود؟"

چوہدری اسود حیدر کے لیے اب نظریں چرانا ممکن نہ رہا۔ اس کے دل نے شدت سے یہ خواہش کی کہ وہ اس راجکماری کے بھائی کے خدشات سچ ثابت کر دے اور اسے چرا کر ابھی اسی وقت چوہدری نگر کے اس گھر میں لے جائے جہاں ایک عورت کے صبح، شام اور رات انتظار کو ساتھ لیے لیے برسوں سے اپنے مدار میں گھوم رہے تھے۔

"ان شاء اللہ۔" فقط یہ ہی کہہ سکا اور یہ ایک لفظ اس کومل سی لڑکی کی آنکھوں کی لو کئی گنا بڑھا گیا۔ وہ ہنس دی۔

نیلے رنگ کے لباس میں وہ روتی ہنستی لڑکی چوہدری اسود حیدر کے دل میں اتر رہی تھی۔

"تم اپنا اور گھر کا نمبر دے دو۔ میں ماں سے بات کروں گی۔"

"اپنا نمبر تو میں دے دیتا ہوں لیکن گھر کا نہیں۔ میں نے تمہیں ڈسکور کیا ہے اس لیے سرپرائز بھی میں ہی دوں گا ماں کو۔"

"اسود! مار کھاؤ گے تم مجھ سے۔" وہ گھورنے لگی تو وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"پتہ ہے امتل..... فیس بک پہ اکاؤنٹ بنانے کے بعد میں نے سب سے پہلے تمہیں سرچ کیا تھا۔ اور میرا دماغ دیکھو، میں ایک امت الاحد کو ڈھونڈتا رہا۔"

"کب کی بات ہے یہ؟" وہ مسکرائی۔

اسود نے اسے وہ سال اور مہینہ بتایا۔

"اور تمہیں پتا ہے اسود..... اس وقت تم درگا دیوی کے نام سے بھی مجھے ڈھونڈتے تو نہ ملتی تمہیں ایف بی پہ۔ اس سے مہینہ پہلے ہی بھاؤ نے میرا اکاؤنٹ ڈی ایکٹیویٹ کر دیا تھا کیونکہ انہیں سرچ بار سے پتا چل گیا تھا کہ میں نے کسی چوہدری اسود حیدر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔"

چوہدری اسود حیدر اس وقت اگر سارے جگ کو بھلا کر اسے دیکھتا رہ گیا تھا تو اس کا قصور نہ تھا۔

"تو سیفی بھاؤ کی مسز کیسی ہیں..... ان کے بارے میں بتاؤ..... سیفی بھاؤ نے اپنی پسند سے کی شادی؟" اسے سب کچھ آج ہی جان لینا تھا۔ وہ چونکا اور پھر اس کے سوال کا جواب دینے لگا۔

اس دن ان دونوں نے ڈھیروں باتیں کیں۔

بہت سی بھیگی باتیں۔

بہت سی مسکراتی باتیں۔

☆☆☆

"امر کولہی۔"

لیجرز کے انبار اور مختلف پلندوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپا بیٹھا عاشق حسین جو حلیے سے یونیورسٹی کا ملازم کم اور پان کھٹکے کی دوکان چلانے والا زیادہ لگ رہا تھا، جو اسے آفس میں داخل ہوتا دیکھ کر اس کی صورت، لباس

www.zemtime.com

اور شخصیت سے مرعوب ہو گیا تھا، اب اس کا نام پڑھ کر اسے یوں دیکھا جیسے کوئی برہمن اپنے قدموں میں پڑے شودر پہ حقارت بھری نگاہ کرتا ہے۔

"کل آنا۔ آج ٹائم نہیں ہے۔"

"میں چار دن سے آ رہا ہوں۔" امر نے اس کے تحقیر آمیز لہجے کو نظر انداز کر کے شائستگی کے ساتھ کہا۔

"بابا..... میرے پہ کوئی احسان تو نہیں کر رہے ناں۔ اب ہمیں صرف تمہاری خدمت کرنے کو تو نہیں بٹھایا گیا ناں۔ اور بھی ہزاروں....." دروازہ کھلا اور پیون نے قطار میں کھڑے لڑکوں میں سے گزر کر جس لڑکے کو جھک کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اسے دیکھ کر عاشق حسین کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ اور وہ مستعدی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سائیں..... تشریف لائیں سائیں۔" کلف زدہ سوٹ اور کلف زدہ تیوروں والا وہ لڑکا جب تک کرسی پہ بیٹھا نہیں، عاشق حسین خود شودر بنا اس برہمن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"حکم سائیں..... بندہ غلام ہے آپ کا۔ سرکار، آپ کے لیے تو بیٹھے ہیں یہاں۔ سائیں آپ کا دیا کھاتے ہیں۔ وقت کیا جان بھی حاضر ہے۔" اس لڑکے کے منہ سے جو بھی جملہ نکلتا، عاشق حسین کا جواب ایسا ہی ہوتا۔ امر نے کھنکھار کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

"میں نے کہا ناں..... کل آنا..... سائیں! آپ ایک فون کر دیتے۔" اسے ٹال کر وہ فوراً ان داتا کی طرف گھوما۔ امر کا دل چاہا کہ اسے گریبان سے پکڑ کر ایسی لات مارے کہ سیدھا جہنم جا پہنچے۔ پر وہ اپنے کمال کے ضبط اور برداشت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا فارم اٹھا کر خاموشی سے پلٹ گیا۔

"سائیں! اب تو کولہیوں نے بھی یونیورسٹی کا منہ دیکھ لیا ہے۔" تضحیک بھرا جملہ اس کے کانوں میں پڑا۔

"عاشق حسین! یہ تو چاند پہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ایسے خدمت گاروں کے بغیر بھلا ہمارے عیش کہاں۔" باہر نکلتے نکلتے جوابی جملہ بھی اسے سنائی دے گیا۔ اور مزید ذلیل کرتے قہقہے بھی اس کے پیچھے تک آئے۔ اس کے اندر ایسی آگ بھڑکی کہ ہر شے جلا کر بھسم کر ڈالنے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔

اس کا سلیکشن انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ہوا تھا مگر دیوی کو کیمسٹری میں جانا تھا تو اس کا ڈپارٹمنٹ بھی تبدیل کروا دیا گیا۔ اس لیے ابھی تک کچھ مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ چار دن سے اے سی ٹو کی ایڈمیشن برانچ میں خوار ہو رہا تھا۔ یہ خواری تو چلو سینکڑوں طلباء کے حصے میں آتی ہے مگر ایسی ذلت ایسی حقارت..... اس موسم میں ماتھے سے بہنے والا پسینہ گردن تک آ پہنچا۔

بھگوان کا اسے اس دنیا میں بھیجنے کا مقصد کیا ہے، اسے آج تک اس سوال کا جواب نہ ملا تھا۔ جواب تو خیر اسے اور بھی کئی سوالوں کے نہیں ملے تھے۔

☆☆☆

"سروں لے کے آیا سی مظہر..... گندلاں وادا کولیاں کولیاں سن۔ سوچیا..... یاسر لئی بنا کے بیج دیواں (سرسوں لے کے آیا تھا مظہر۔ ڈنٹھل خوب نرم نرم تھے۔ سوچا کہ یاسر کے لیے بنا کر بھیج دوں)" پھوپھو فردوس نے داتر کے ساتھ ساگ کترتے ہوئے رحیمہ احمد کو بتایا۔

'ہ' کو پی جانے والی پھوپھو فردوس نے بچوں کے نام بھی چن چن کر ایسے رکھے کہ 'ہ' جس کا لازمی جزو تھا۔ مظہر، اطہر، طاہر، مہر تاب۔ اور ادا کرتی تھیں مظر، اطر، میرو..... طاہر کو البتہ طاری پکارتی تھیں۔ رباب شکر کرتی تھی کہ اس کے نام میں 'ہ' نہیں۔

جی تو مومنہ حیدر کو ماں کے ساتھ پھوپھو فردوس کے گھر داخل ہوتے ہی ساگ نظر آیا تھا۔ اتنا بڑا سارا تسلہ وہ اپنے باورچی خانے میں چڑھا دیکھ کر آ رہی تھی۔ کل پوری شام ماں اور امی ساگ کاٹنے میں لگی رہیں۔ آج اس نے دن بھر پکتے رہنا تھا۔ پھر اسے گھوٹا لگانا تھا..... ایک اور محنت طلب کام۔ اس کے بعد تڑکنا بھی تھا۔ اف..... خواتین اس گھاس نما چیز کے لیے کیوں کرتی ہیں اتنی محنت۔

www.zemtime.com

اس نے جھنجلا کر سر ہلایا۔

"امی بھیجیں گی ناں یاسر بھائی کو ساگ۔ پھر آپ کیوں کر رہی ہیں اتنی محنت پھوپھو۔"

"تیری ماں کوٹا ٹھیک نئیں لاندی (تمہاری ماں ساگ گھوٹتی ٹھیک نہیں)۔" انہوں نے "رہنے ہی دو" والے انداز میں ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

"چلو جی....." وہ ہنسی اور مہرتاب کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"اللہ بخشے ..... باء جی نوں وی بڑا پسند سی ساگ (بھائی جی کو بھی ساگ بڑا پسند تھا)۔"

رحیمہ احمد نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"ہندنی داغم مار گیا۔ کیڑی عمر سی جان دی (ہندو بچی کا غم مار گیا ورنہ کون سی عمر تھی جانے کی)۔"

رحیمہ احمد کو بڑی تکلیف ہوئی۔ آپا فردوس امت الاحد کا ذکر ایسے لفظوں میں ہی کرتی تھیں۔ وہ تو آپا کا حال پوچھنے آئی تھیں اور انہوں نے ان کا حال نہ سمجھا۔ انہیں ساگ کے لیے بھائی کی پسندیدگی یاد رہی، امت الاحد کے لیے ان کی محبت نہیں۔

"ہون تیاڈی طبیعت کیہو جی اے۔ پاء صادق دس رے سی کہ رات کھانسی ہوندی رئی تیانوں (اب آپ کی طبیعت کیسی ہے..... بھائی صادق بتا رہے تھے رات کو کھانسی ہوتی رہی آپ کو)؟"

انہوں نے جلدی موضوع بدلا۔

اندر مہرتاب کے کمرے میں رباب ہاتھ میں "خواتین" لیے بیٹھی انہیں اپنا خط سنا رہی تھی۔ تینوں کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی، جوش تھا۔ ان کا نامہ شائع ہو گیا تھا۔

"میں فاطمہ کو جا کر بتاتی ہوں۔" مومنہ نے سرشاری سے کہا۔

"ہائے میرا نام کتنا اچھا لگ رہا ہے پرنٹ ہو کے۔" مہرتاب نے اپنے نام پہ ہاتھ پھیرا۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ کوئی ناول لکھوں۔ اور ان کو بھیجوں۔ رائٹر بننا میری ہمیشہ سے آرزو ہے۔" رباب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"یہ تمنا ابھی ابھی تیرے دل میں جاگی ہو گی..... ہاتھ کا لکھا خط کیا شامل ہو گیا، رباب بی بی خواب دیکھنے لگیں۔"

مومنہ کے کہنے پہ رباب نے اسے گھورا۔ مومنہ نے اسے گھورا۔

"میں نے اطہر کو دو ہزار دے دیے ہیں ہما کوکب بخاری کا "ماہی ماہی کوکدی میں" منگوانے کے لیے۔ پانچ پانچ سو دے دینا اب تم تینوں مجھے۔" مہرتاب نے اطلاع دی۔

"ماہی ماہی کوکدی دو ہزار کا ہے؟" مومنہ نے مہرتاب کی ایمان داری پہ سوال اٹھایا۔

"اطہر کو دیے ہیں ..... باقی اس کے ہیں۔ ویسے منگوا کر دیتا کیا وہ۔"

"کتنا کمینہ ہے تیرا بھائی۔ ہمایوں اچھا ہے۔ کبھی کبھی تو پیسے لیتا بھی نہیں۔"

"اچھا ..... بڑا اچھا لگ رہا ہے آج تجھے ہمایوں۔" مہرتاب نے کمر پہ ہاتھ رکھا۔

"دفع ہو۔ اور اب اطہر کو کہنا کہ پھوپھو کے سامنے ناول نہ کہے، کتاب کہے۔ ورنہ پھوپھو نے ایسا رولا ڈالنا ہے کہ اس طرف امی کو بھی پتا چل جانا ہے۔ اور میرے پانچ سو میری ہونے والی بھابی سے لے لینا۔"

ہونے والی بھابی کی آنکھیں باہر آئیں۔

"ناں..... اس پانچ سو میں کچھ اور ڈال کر میں یاسر کے لیے پرفیوم نہ لے لوں۔"

"پرفیوم رہنے دے..... ان کے لیے کباب، بریانی بنا دے۔ ورنہ ماں اور ساس نے تو ساگ کھلا کھلا کر بکرا بنا دینا ہے میرے بھائی کو۔"

شام کو ہمایوں کراچی جا رہا تھا۔ اس لیے یاسر کے لیے پتا نہیں کیا کچھ بن رہا تھا۔ ماں ابھی گاجر کا حلوا بنا کر آ رہی تھیں۔ السی کی پینیاں اور چنوں کا پانڈا الگ پیک ہوا تھا۔

یاسر بھی ناں ..... چیز تھا پوری۔ مظہر سے چھوٹا تھا مگر بھائیوں کے بچوں میں پہلی پہلی اولاد تھا۔

www.zemtime.com

لاڈوں میں پلا ہوا..... پہلے ہاسٹل اور اب کراچی سے جب آتا۔

"پانی اچھا نہیں..... کھانا اچھا نہیں۔ پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔

چلو جی ماں اور امی راج دلارے کی شکل اور صحت دیکھ کر ہول جاتیں۔ دیوار پار ہونے والی ساس اور منگیتر کا حال بھی یہی ہوتا۔ اس لیے کوشش ہوتی کہ ہر پندرہ دن بعد جب آتا ہے تو اتنا کچھ بنا کر ساتھ دے دیا جائے کہ اسے ہوٹل کا کھانا نہ پڑے۔ بیچ میں کوئی کراچی جاتا تو پنڈ باندھ کر اس کے ہاتھ میں بھی تھما دی جاتی۔

"میرے ہاتھ کی بریانی اور کباب کھانے ہیں تو اسے چوہدری نگر آنا ہوگا۔" آج تو رباب کی اداؤں میں بے نیازی تھی۔

"اچھا نہ بنا..... وہی کہہ رہے تھے کہ کباب بڑے مزے کے تھے۔"

"کب کب؟" بے نیازی ختم ہوئی اور وہ مومنہ کے سر ہوئی۔

"بھئی، جب پچھلی بار آئے تھے۔"

"میسنی! آج بتا رہی ہے۔ پہلے زبان پہ آبلے پڑے تھے کیا..... اور بتا کیا کہہ رہے تھے..... تو نے بتایا تھا کہ رباب نے بنائے تھے۔ وہ کباب اور وہ چکن کڑاہی بھی؟"

لو جی..... اب دور باب بی بی کے سوالوں کے جواب۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ مومنہ حیدر کو آج ساگ نہیں کھانا پڑے گا۔

بریانی، کباب..... اس کے منہ میں پانی آیا، ساتھ ہی مہرتاب کو آنکھ ماری۔ وہ ہنس دی۔ ساتھ ہی اسے اپنے اسپیشل ریسپی سے تیار کیے گئے کبابوں کا حال یاد آیا۔ بے فائدہ رہی تھی ساری محنت۔ اب کے وہ بڑے گوشت کی کوئی ڈش نہیں بنائے گی۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

یہ پہاڑی ہاسٹل کے اے بلاک کے سامنے تھی۔ اس کی اونچائی بہت زیادہ نہیں تھی۔ اے بلاک کی اینٹرنس کے عین سامنے اس پہاڑی پہ سہولت سے چڑھنے کے لیے آٹھ دس زینے بنا دیئے گئے تھے۔ اکثر لڑکیاں شام میں ہاتھ میں چائے کے بڑے بڑے مگ تھامے ٹولیوں کی شکل میں یہاں آجاتیں۔ جن لڑکیوں کو اپنے روم میں پڑھنے کے لیے پرسکون ماحول میسر نہ ہوتا وہ بھی دور دور بڑے بڑے پتھروں پہ بیٹھی ہوئیں اپنے نوٹس، اپنی کتابوں میں محو نظر آتیں۔ کبھی کبھار لڑکیاں سج سنور کر انہی پتھروں پہ بیٹھ کر تصویریں بنواتی تھیں۔

اسی پہاڑی کے ایک کونے میں جہاں نسبتاً کم روشنی ہوتی تھی۔ درخت کا موٹا سا ٹوٹا ہوا تنا پڑا تھا۔ وہ اکثر اسی تنے پہ آکر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں یہیں بیٹھے بیٹھے بیت جاتے۔ وہ اپنے کمرے سے جس قدر ممکن ہو، دور ہی رہتی۔ جس الاؤ سے وہ نکل کر آئی تھی وہی ہاسٹل میں اس کے کمرے میں دہکتا۔ ایک دیوار پہ بھگوان کرشن کی تصویر تھی تو الماری پہ لگے پوسٹر پہ کالی ماتا زبان نکالے نظر آتی۔

جگدیش مہیشوری نے اس کی الاٹمنٹ اس کمرے میں کروائی تھی جہاں باقی تینوں لڑکیاں ہندو تھیں۔ ایک ہی زبان، ایک ہی مذہب، ایک ہی کمیونٹی، ایک ہی مسلک کی لڑکیاں اکثر ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں۔ اس کمرے میں بھی پہلے چاروں ہندو لڑکیاں تھیں۔ پہلے اس کی الاٹمنٹ ایک ایسے کمرے میں ہوئی تھی جس میں مسلمان لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ بھاؤ نے یہ قبول نہ کیا اور ایک لڑکی درشنا کی الاٹمنٹ پورنیما کے کمرے سے کینسل کروا کر اس کی الاٹمنٹ وہاں کروائی۔ ویسے تو وہاں اور کئی کمرے تھے جن میں ہندو لڑکیاں تھیں مگر اسے خاص طور پر اس کمرے میں رکھنے کی وجہ پورنیما تھی۔

پورنیما..... پری..... اس لڑکی کو دیکھ کر ہی اس کا منہ کڑوا ہو جاتا۔ اس کے ساتھ رہنا تو امتحان تھا اور بھاؤ کو شوق تھا اس کو امتحانوں میں گھرا دیکھنے کا۔

اسے لگتا کہ وہ کس وقت سو رہی ہے، کس وقت جاگ رہی ہے، کیا کھا رہی ہے، کیا پی رہی ہے، کون سی کتاب پڑھ رہی ہے، کس لڑکی سے مل رہی ہے۔ یہ

www.zemtime.com

سب جاننے کے لیے پری اس پہ نظر رکھتی ہے۔ یہاں تک تو وہ برداشت کر لیتی مگر اس کی سوال و جواب کی عادت بھی بہت تھی۔ وہ اس کی ماں نہیں تھی کہ اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہتی۔ اس لیے اس کی موجودگی میں وہ اکثر کمرے سے باہر نکل آتی۔ اور آ کر اس تنے پر بیٹھ جاتی۔ ویسے بھی اس کو تنہا رہنا پسند تھا۔ اصل میں جب وہ تنہا ہوتی تھی تو تنہا نہیں ہوتی تھی۔ ماں نے کہا تھا ناں۔

''امت الاحد! تم وہاں اکیلی نہیں ہو گی۔ احد ہو گا ہر پل، ہر لمحہ ہر، جگہ تمہارے ساتھ۔''

اس رات اس کو رخصت کرنے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے یہ بھی کہا تھا۔

''وہ احد ہے، جو بات کرنا ہو، اسی سے کرنا۔ جو مانگنا ہو، اسی سے مانگنا اسی کے آگے جھکنا کبھی پتھروں کے آگے ہاتھ مت جوڑنا۔''

اصل میں جب وہ تنہا ہوتی تھی تو تنہا نہیں ہوتی تھی۔ اس کی سوچ کے دریچے وا ہوتے اور وہ اس جہان میں پہنچ جاتی جہاں وہ اس مادی دنیا کو یکسر فراموش کرنے میں کامیاب رہتی۔ یہی تو وہ کنجی تھی جس سے ہر تالا کھول کر وہ جب چاہے، اس دنیا میں قدم رکھ دیتی تھی، جہاں ہر رنج، ہر غم کی اکسیر دوا تھی۔

لڑکیاں اس شام سی سلونی لڑکی کو تن تنہا یہاں آسمان کی اور نگاہیں جمائے بیٹھے دیکھ کر حیران ہوتیں، بعض متجسس ہوتیں اور بعض منچلیاں اس پہ فقرے بھی کستیں۔ ان میں سے کوئی نہ جانتی تھی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ایک امتل اپنے احد سے باتیں کیا کرتی ہے۔

☆☆☆

سرمئی گیٹ والے گھر میں رات اتر چکی تھی۔ صحن میں بچھی چارپائی سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز صحن کے سناٹے کو کم کر رہی تھی۔ کبھی کبھی لشکیلے بدن والے لیلے کی منمناہٹ بھی فضا کے سکوت کو توڑ دیتی جس کے لیے رحیمہ احمد دن میں کئی بار تو ضرور ہی ہمایوں سے پوچھا کرتیں۔

''کچھ پتا چلا؟''

اور وہ نفی میں سر ہلا دیتا۔ اس کو اس لیلے سے زیادہ غلام علی اور اس کے خاندان کی فکر تھی۔

''روتا ہے..... ماں کو یاد کرتا ہے۔'' وہ تڑپ تڑپ جاتیں۔ انہیں لگتا، لیلا یہاں تنہا ہے اور اس کی ماں کہیں کسی اور جگہ۔ بے زبان کسی کو دل کا حال بھی سنا نہ پاتی ہو گی۔

''کیا ظلم کر گیا غلام علی۔'' فیڈر سے اسے دودھ پلاتے ہوئے وہ دن میں کئی بار بڑبڑاتیں۔

اب لیلے نے رونا چھوڑ دیا تھا۔ رحیمہ احمد کو دیکھ کر منمناتا تھا۔ ان کو دیکھ کر قلانچیں بھرتا ان کے پاس آتا تھا۔

کیا وہ بھی انہیں ماں سمجھنے لگا تھا..... جیسے ایک پونے چار سال کی بچی سمجھنے لگی تھی۔

وہ پیار سے اس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا کرتیں۔

خیر بات ہو رہی تھی آج رات کی..... سرمئی گیٹ والے گھر میں رات کا سکوت تھا۔ چوہدری صاب کے خراٹوں کی آواز اور لیلے کی منمناہٹ برآمدے کے پار دائیں جانب والے آخری کمرے تک نہ پہنچ پاتی۔ جہاں کچھ دیر پہلے تک تو ٹائم پیس کی ٹک ٹک تھی۔ اس کے بعد یہاں چوہدری اسود حیدر کی آواز سنائی دی تھی اور پھر خاموشی سی خاموشی تھی۔

کئی پل بیتے، رحیمہ احمد یونہی ساکت سی بیٹھی تھیں۔

آج تک وہ سوال کرتی آئی تھیں اسود سے۔

آج اس نے سوال کر دیا تھا۔ اور سوال بھی ایسا کہ جان لیوا.....

''امتل سے ملیں گی ماں؟'' اس نے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔

وہ اسے تکتی رہیں، تکتی رہیں۔ پھر آنکھوں کی شفاف سطح پہ پانی سا چمکا۔

انہیں اپنی سماعت پہ یقین نہ تھا۔ سات سال دو مہینے تین دن بعد کسی نے ان سے یہ سوال کیا تھا۔ کم نہیں ہوتے سات سال دو مہینے تین دن۔ صدیوں

www.zemtime.com

جیسے ہوتے ہیں۔ یہ سال یہ مہینے یہ دن اور..... اور لمحے بھی۔

پانی آنسو بنا اور آنکھ سے ٹپکا۔

اسود ان کا ہاتھ تھامے انہیں دیکھتا رہا۔ حبہ نے لحاف میں کروٹ بدلی تھی..... وہ بھی سو رہی تھی اس رات اسی طرح۔ جب انہوں نے اسے جگا ڈالا تھا۔

ان کی آنکھ سے نکلتا پانی سیلاب کا ریلا بنا۔

"میں ملا ہوں اس سے۔ بڑی ہو گئی ہے۔ مگر باتیں ویسی ہی ہیں اس کی۔" وہ ہنسا۔

سیلاب کا ریلا ہر بند توڑنے لگا۔

"کہتی ہے، ہم پیار نہیں کرتے اس سے۔ بھول گئے اسے۔" وہ پھر ہنسا۔ اس بار آنکھ میں اور ہنسی میں نمی سی تھی۔

حبہ نیند میں ہنسی تھی۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ شاید کوئی اچھا خواب دیکھ رہی ہو گی جس میں چاکلیٹس ہوں گی، کیک ہو گا، رنگ برنگی ٹافیاں ہوں گی بڑی سی سر ہلا ہلا کر گاتی ہوئی آنکھیں جھپکتی ہوئی گڑیا ہو گی۔ رحیمہ احمد بھی خواب میں کبھی کبھی ہنستی تھیں..... وہ خواب جس میں امت الاحد ہوتی تھی۔

یہ ان کا ہاتھ تھامے ان کے سامنے بیٹھا اسود آج کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ان خوش رنگ خوابوں کی تعبیر کا مژدہ سنا رہا تھا یا یہ بھی کوئی سپنا تھا۔

وہ ابھی تک بے یقینی کی سی کیفیت میں تھیں۔

"پتا ہے ماں..... اس کے ہاتھ میں بھی سونے کا چھلا ہوتا ہے..... یہ جیسا آپ کا۔" اس نے ان کے چھلے پہ انگلی پھیری۔ "اور دوپٹہ بھی آپ کے انداز میں اوڑھتی ہے۔"

رحیمہ احمد نے ایک ہاتھ سے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"اور وہ بال بھی آپ کی طرح بناتی ہے..... یوں جیسے آپ یہ پیچ سے یوں....." اس نے ان کی مانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رحیمہ احمد گیلی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہنس دی تھیں۔

☆☆☆

من یوں بھی مرادیں پاتا ہے!

خواب یوں بھی زندہ تعبیر بن جاتے ہیں!

وہ بہت حیران تھی، وہ بہت بے یقین تھی، وہ بہت خوش تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب اسے ایک مہمان کی اطلاع ملی تھی، اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چند لمحوں بعد اس کے سامنے وہ چہرہ ہو گا جسے سوچنے کے لیے وقت کا پابند ہونا پڑتا ہے نہ ہی حالات کا۔ لیکن دیکھنے کے لیے وہ بہت ترسی تھی، بہت تڑپی تھی۔

برسوں سے پیاسی اس کے من کی دھرتی پہ اچانک جو یوں مینہ برسا تو وہ جانے کتنی ہی دیر سیراب ہوتی رہی۔

"کیسی ہے میری بیٹی؟" رحیمہ احمد نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔ وہ کوئی جواب نہ دے پائی اور پھر سے ان کے اندر گم ہو گئی۔ ان کے جلتے کلیجے پہ پھوار پڑ گئی۔

"امت الاحد! کتنا تڑپایا ہے تو نے مجھے، یہ چہرہ تو میری آخری خواہش بننے لگا تھا۔"

وہ کچھ نہیں سن رہی تھی، کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس محسوس کر رہی تھی اس خوشبو کو جس کے جملہ حقوق صرف اولاد کے نام ہوتے ہیں۔

جب اس کی آنکھوں سے بہنے والا پانی رحیمہ احمد کو اپنی قمیص کی سرحد پار کرتا محسوس ہوا تو انہوں نے تڑپ کر اسے خود سے الگ کیا۔

"امت الاحد! مت رو۔ ایک ماں کے لیے سب سے تکلیف دہ چیز اس کے بچے کی آنکھ میں آنسو ہوتے ہیں۔"

"آپ..... آپ بھی تو رو رہی ہیں۔" اس نے اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے آنسو تو خوشی کے ہیں میری بچی۔" انہوں نے کہتے ہوئے چہرے پہ بکھرے موتیوں کو اپنی چادر کے پلو میں جذب کیا۔

"میرے بھی خوشی کے ہیں۔" وہ فوراً بولی تو

www.zemtime.com

رحیمہ احمد ہولے سے ہنس دیں۔

"وہ انہیں لے کر سنگی بینچ کی طرف آ گئی۔ انہیں کندھوں سے تھام کر دھیرے سے اس پہ بٹھایا اور خود بھی ان کے بہت قریب بیٹھ گئی۔ اور ان کا سونے کے چھلے سے سجا گلابیاں جھلکاتا سفید ہاتھ تھام کر نظروں سے اپنی پیاس بجھانے لگی۔

حسن و صبر کا انوکھا امتزاج تھی ان کی ذات۔

سامنے والے کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان کے بے تحاشا خوبصورت چہرے سے وہ نظریں ہٹائے کیسے۔ اور صبر و شکر کا وصف جوان کے چہرے کو ہمہ وقت روشن رکھتا ہے، اس بارعب چہرے پہ وہ نظریں ٹکائے کیسے۔

شکوہ کرنا تو انہیں آتا ہی نہ تھا۔ آتا تھا تو صرف اپنے رب سے مانگنا، آتا تو صرف اپنے رب کا شکر ادا کرنا۔ جو مانگا وہ ملا تو شکر، نہ ملا تو بھی شکر۔ کبھی بندوں سے اپنی حاجت بیان نہ کی۔ سر تا پا، لباس، شال، جوتا، پرس کچھ بھی برانڈڈ نہیں تھا، ہر شے عام سی تھی۔ مگر اس میں بھی ان کی شخصیت میں اتنا وقار، اتنی بے نیازی، اتنی تمکنت جھلک رہی تھی کہ کسی رانی کسی ملکہ کے پاس بھی یہ خزینہ کہاں۔

"آپ بالکل بھی نہیں بدلیں ماں..... آپ آج بھی ویسی ہی ہیں بہت پیاری..... اتنی پیاری، اتنی پیاری کہ بس بہت پیاری۔" اس نے ان کے کان کی کلی کو چھوتے ہوئے کہا۔

رحیمہ احمد دھیرے سے ہنس دیں، ایسے جیسے ایک ماں اپنے بچے کی معصومیت بھری بچکانہ سی بات پہ ہنس پڑتی ہے۔

"اور میں..... میں بہت بدصورت ہو گئی ہوں ناں ماں۔"

رحیمہ احمد نے تڑپ کر اس ٹوٹے کانچ سے لہجے والی کی من موہنی صورت دیکھی اور اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم تو میری دنیا کا سب سے خوبصورت چہرہ ہو امت الاحد۔"

"داسیوں کے چہرے بھی کبھی پیارے ہوتے ہیں ماں!"

ایک ساتھ کتنی ہی برچھیاں چلیں رحیمہ احمد کے کلیجے پہ۔

"تم داسی نہیں، تم تو امت الاحد ہو میری جاں۔"

"میں امت لاحد ہی ہوں ناں ماں؟" اس کی شناخت، اس کی پہچان کو اتنی بار زہر دیا گیا تھا کہ اب وہ یقین کا امرت بار بار پینا چاہتی تھی۔

"ہاں..... تم امت الاحد ہو۔" انہوں نے اس کے گھنیرے سیاہ بالوں پہ اپنے لب رکھتے ہوئے یقین اور پیار کی مہر ایک ساتھ ثبت کی۔

"بہت ترسی ہوں بہت مچلی ہوں ماں اس نام کے لیے۔ کیوں چھین لی گئی میری یہ شناخت مجھ سے۔ کیوں امت الاحد کا نام بدل کر گیا..... کیوں....."

رحیمہ احمد نے جلدی سے اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں امت الاحد! نہیں..... اللہ کو رب العالمین جاننے والوں کو، اس کو وحدہ لاشریک ماننے والوں کو جہنم کی نہیں بلکہ اس کی رحمتوں کی بات کرنی چاہیے۔ اللہ تم سے دور نہیں بس یوں سمجھ کہ اس کی محبت ثبوت مانگ رہی ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے تمہیں امتحانوں سے بھی گزرنا ہے، اور قربانیاں بھی دینی ہیں۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"اللہ جانتا ہے ناں کہ میرا دل اس کی محبت سے لبریز ہے پھر ثبوت....." بات ادھوری چھوڑ کر وہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اللہ جانتا ہے پر بندے نہیں جانتے۔"

"میں اللہ سے اپنی محبت ثابت کر پاؤں گی ناں ماں؟" بڑی آس سے اس نے پوچھا۔

"ان شاء اللہ۔" ان کے لہجے کے یقین نے اس کے چیروں چیر دل پہ پل بھر میں مسیحائی کا پھاہا رکھا۔ انہوں نے اس کو پھر سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ مامتا کی مہک اس پہ مدہوشی طاری کرنے لگی تھی کہ موبائل کی بپ نے چونکا دیا۔ اس نے ان سے الگ ہوتے ہوئے اپنا فون اٹھایا۔

www.zemtime.com

"اسود ہے۔" اس کا نام اسکرین پہ جگمگاتا دیکھ کر اس نے کہا اور کال ریسیو کی۔

"میری ماں کو زیادہ تو نہیں رلایا تم نے؟" اسود نے سلام کا جواب دیتے ہی پوچھا۔

"اسود! تم نے بتایا کیوں نہیں تھا کہ تم ماں کو لا رہے ہو؟" اس کے سوال کو نظر انداز کر کے شکوہ کیا۔ "سر پرائز دینے کا تو بہت شوق ہے ناں تمہیں۔"

"ہاں..... وہ تو ہے، اچھا اب جلدی سے ماں کو بھیج دو۔ ہمیں واپسی کے لیے نکلنا ہے۔"

"ابھی!!" وہ چیخی۔ "ابھی تو میں نے جی بھر کے انہیں دیکھا بھی نہیں..... جی بھر کے ان سے باتیں بھی نہیں کیں۔" ان کے چلے جانے کے خیال سے ہی اس کا دل رکنے لگا۔

"آپ کی یہ خواہشیں ناتمام نہیں رہیں گی..... وعدہ ہے چوہدری اسود حیدر کا آپ سے..... فی الحال ہمیں جانا ہے۔ میں گیٹ پہ انتظار کر رہا ہوں۔"

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے موبائل کان سے ہٹایا۔

"اتنی جلدی کیوں جائیں گی آپ؟"

"آج جلدی جانے کی خواہش تو مجھے بھی ہے امت الاحد..... اپنے رب کے حضور جھک کر اس کا شکر جو ادا کرنا ہے۔"

کوئی اس کو دعاؤں میں شامل رکھتا ہے۔ کوئی اس کے لیے سجدوں میں گرتا ہے۔

اپنی قسمت سے شکوہ کناں رہنے والی لڑکی کو خود پہ بے تحاشا رشک آیا۔

اچانک اسے کچھ خیال آیا تو وہ جلدی سے سامنے فروٹ والے کے پاس آئی۔ ایک گلاس جوس کا آرڈر دے کر نگاہیں لان میں بیٹھی رحیمہ احمد کی پشت پر جما دیں۔

"کاش! میں ان لمحوں کو تھام سکتی۔"

حسرت سی حسرت تھی اس کے اندر۔

اس کے سامنے جوس کا گلاس آیا تو وہ چونکی۔ پھر گلاس تھام کر ان کی طرف آ گئی۔

"یہ تم کن تکلفات میں پڑ گئیں امت الاحد!" ماں نے خفگی دکھائی۔

"آپ اتنا سفر طے کر کے آئیں اور میں کتنی پاگل ہوں، کچھ خیال نہیں کیا۔"

"میری پیاس تو تمہاری صورت دیکھ کر ہی مٹ گئی تھی میری جان، میری تھکن تو تمہارے منہ سے "ماں" سن کر ہی اتر گئی تھی۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور گلاس لبوں سے لگا لیا۔

اس کا موبائل دوبارہ سے گنگنایا۔ اس نے اٹھا کر کالر کا نام دیکھا اور موبائل سوئچ آف کر دیا۔

"اسود ہوگا۔" رحیمہ احمد نے سوچا اور جلدی سے جوس ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وہ انہیں لے کر گیٹ تک آئی۔ ریسپشن سے ان کا شناختی کارڈ واپس لے کر دیا اور ان کی واپسی کا ٹائم نوٹ کروا کر گیٹ سے باہر لیے آ گئی۔ اسود سامنے ہی کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر سڑک پار کر کے ان کے قریب آیا۔ امتل کو سلام کرتے ہوئے اس نے رحیمہ احمد کے دمکتے چہرے پہ نگاہ بھی ڈالی۔

"آپ دونوں خواتین کی آج پکی سازش لگ رہی تھی اسود کو اسود (سیاہ) بنانے کی۔"

رحیمہ احمد مسکرا دیں۔ امت الاحد نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ سندھ کی فروری بھی ایسی ہی تھی۔

"امت الاحد جوس بنوانے چلی گئی۔ پھر پینے میں کچھ دیر ہو گئی۔" رحیمہ احمد بولیں۔

"اچھا..... ویسے میرا خیال ہے آپ کی امت الاحد کو لگتا ہے کہ چوہدری اسود حیدر کو تو پیاس لگتی ہی نہیں۔ انرجی کی اسے ضرورت ہی نہیں۔" اس نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس پہ چوٹ کی۔

"جس شخص سے مجھے شکایتیں ہوں، اسے جوس نہیں پلاتی میں۔" اس نے روٹھے انداز میں کہا۔

"میرے رب..... آج بھی یعنی کہ آج بھی لوگوں کو مجھ سے شکایتیں ہیں۔ آج تو بچھڑے ہوؤں

www.zemtime.com

کو ملوایا ہے، دعاؤں پہ حق بنتا ہے۔"

اس نے دہائی دی تو رحیمہ احمد نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اسود نے سامنے قطار میں کھڑے رکشوں میں سے پہلے کو اشارہ کیا۔

"اچھا بیٹا! اب اجازت دو۔" رحیمہ احمد نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ یوں لگا کہ دوریاں ایک بار پھر اس کا مقدر بننے والی ہیں۔

"نہیں..... امت الاحد! رونا بالکل نہیں۔ رب نے ابھی ملایا ہے تو ہمیشہ کے لیے دوریاں بھی مٹا دے گا۔ ان شاء اللہ۔" رحیمہ احمد نے نم آلود لہجے میں تسلی دی اور اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ اس کا ان سے الگ ہونے کو دل نہ چاہ رہا تھا، وہ اس قرب میں اپنی ہر سانس جینا چاہتی تھی۔ اس قید میں اپنی عمر بتا دینا چاہتی تھی۔

اسود کو کھنکھارنا پڑا۔ بادل نخواستہ ان سے الگ ہوتے ہوئے اپنی گلابی آنکھوں سے اسے گھورا۔ وہ مسکرا دیا۔

جب تک رکشہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوا، اس نے پلکیں نہ جھپکیں۔ اور جب وہ اس کی نگاہ کی حد سے آگے چلا گیا تو وہ اپنی نم آنکھوں کو مسلتے ہوئے پلٹی۔

"دیوی!" امر اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ بوکھلا گئی۔

"تم..... تم کب آئے؟"

"پندرہ منٹ پہلے..... آپ کے سیل پہ رنگ کیا تھا لیکن آپ..... یہ کھانا اور کپڑے آئے ہیں آپ کے لیے گھر سے۔" اس نے فوڈ کیریئر اور دو تین شاپنگ بیگز بڑھاتے ہوئے کہا۔

اسے یاد آیا، امر نے کال تو کی تھی۔ یقیناً اپنے آنے کی اطلاع دینا چاہتا ہوگا۔ لیکن اس نے امر کا نام دیکھ کر موبائل بند ہی کر دیا تھا۔ اس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے سامان لے لیا۔

"اور کوئی کام تو نہیں۔" اس نے حسب عادت پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ جانے کے لیے پلٹنے لگا۔

"امر!" اس نے اس کے اٹھتے قدموں کو زنجیر پہنائی۔

"جی!" وہ پلٹا اور اس کے سامنے آ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

"گھر میں مت بتانا..... میرا مطلب ہے کہ ماں اور اسود کے یہاں آنے کے بارے میں۔"

وہ خاموش کھڑا رہا۔

"نہیں بتاؤ گے ناں۔" اس نے پھر پوچھا۔

امر نے نگاہیں اٹھائیں۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا کر نہ بتانے کا وعدہ کیا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔ وہ مطمئن ہو کر ہاسٹل کے اندر آ گئی۔ اچھا تھا کہ امر سے وعدہ لے لیا تھا ورنہ جانے کب وہ بھاؤ کے سامنے نمک کا حق ادا کر جاتا۔

☆☆☆

ہر وقت یہ وہم ستاتا تھا کہ جانے وہ اسے دوبارہ کبھی دیکھ پائیں گی یا نہیں۔ اور اگر کبھی دیکھ لیا تو وہ انہیں پہچان بھی پائے گی یا نہیں۔ اگر پہچان لیا تو اس کے انداز میں پہلی سی محبت، پہلی سی وارفتگی بھی ہوگی یا نہیں۔ مگر آج سارے وہم مٹ گئے تھے۔ تمام خدشے باطل ہو گئے۔

ان کی نگاہیں کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس مقام پہ جا کر رک گئیں جہاں اسود، مومنہ کے لیے اس کے پسندیدہ روٹر پیک کروا رہا تھا۔

"اسود! کیسی ٹھنڈ ڈالی ہے تو نے میرے کلیجے میں۔ اللہ تجھے اس کا اجر دے۔" ان کے دل سے دعا نکلی۔

کل رات بھی کتنی لمبی تھی۔ بیت ہی نہ رہی تھی۔ سویرے کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہوا۔ اور جب انہوں نے بتایا کہ وہ اسود کے ساتھ حیدر آباد جا رہی ہیں تو سب حیرت میں پڑے۔ وہ تو پہلے ہی اسود کی اچانک آمد پہ حیران تھے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو آیا تھا۔ اتنی جلدی تو وہ دوبارہ گھر نہیں آتا تھا۔

رحیمہ احمد نے ہر طرف سے آنے والے سوالوں کے الٹے سیدھے جواب دیے۔

"ماں! یہاں اس کی شناخت امت الاحد نہیں بلکہ درگا دیوی ہے۔ اس کو اسی نام سے اس کے روم

www.zemtime.com

سے بلوائیے گا۔"

بعض حقیقتوں کو قبول کرنا بڑا جوکھم ہوتا ہے۔ ان کا دل رو دیا، سر نفی میں ہلا۔ مگر انہیں امت الاحد کو درگا دیوی کہہ کر ہی بلوانا پڑا۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ پل آگے تھے۔

"میں امت الاحد ہی ہوں ناں ماں؟" آنکھوں میں اور لبوں پہ یہ سوال لیے وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بہت ترسی ہوں، بہت مچلی ہوں ماں اس نام کے لیے۔ کیوں چھین لی گئی میری یہ شناخت مجھ سے۔ کیوں امت الاحد کو درگا دیوی کا نام دے کر تکلیف دی گئی....."

رحیمہ احمد نے جلدی سے نفی میں سر ہلا کر اس منظر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ جہاں وہ اس بات پہ خوش تھیں کہ ان کے دیئے ہوئے نام کے ساتھ امت الاحد کے دل کا رشتہ ابھی تک بہت مضبوط ہے، وہیں اس کا پابندیوں میں جکڑا، آزمائشوں میں گھرا وجود انہیں تڑپا رہا تھا۔

"اے میرے رحمن و رحیم! تو کرم کر، تو کرم کر میری بچی پر۔" ان کا روم روم حالت دعا میں تھا۔

اسود نے وین میں ان کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے ایک نظر ان پہ ڈالی۔ رحیمہ احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ماں! آپ خوش ہیں ناں؟" اس نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"بہت خوش ہوں میرے بچے، تم سے بھی اور اپنی قسمت سے بھی۔" انہوں نے ایک نرم سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

رحیمہ احمد نے سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ خود کو دو متضاد کیفیات میں گھرا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔ بہت خوش بھی تھیں اور بیک وقت بہت مضطرب بھی۔ لیکن ضروری تو نہیں کہ سب کے سامنے ہر کیفیت کو آشکار بھی کیا جائے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی پریشانی اپنے اضطراب کو دل میں چھپا کر ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجالی تھی۔

☆☆☆

اس نے چہرے کو ذرا سا اٹھا کر گہرا سانس لیا۔ جیسے حالت نزع میں کسی کو نوید حیات مل جائے اور وہ زندگی کے احساس کو پوری طرح سے محسوس کرنا چاہے۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے گھٹنوں پہ بازو اور بازوؤں پہ اپنا چہرا ٹکائے اسی تنے پہ بیٹھی تھی، جہاں وہ اپنے احد سے پیار بھری باتیں کیا کرتی، اس کے سامنے اپنے دکھ روتی، اس سے ڈھیروں شکوے کرتی۔ لیکن آج وہ بہت خوش تھی اور اس کا شکر ادا کر رہی تھی۔ ایک مسکراہٹ تھی جو گلابی پنکھڑیوں پہ مسلسل شان سے براجمان تھی۔

"امتل!"

اس نے کرنٹ اٹھا کر گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا اور تقریباً پورا مڑتے ہوئے وہاں دیکھا جہاں سے اسے یہ پکار آئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی ایک لڑکی ہاتھوں میں آئس کریم کون تھامے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پہلے مجھے شک تھا مگر اب یقین ہے کہ تم امتل ہو۔ امت الاحد یا امت الواحد یا....." وہ جیسے کسی سوچ میں پڑی۔

"امت الاحد کہو یا امت الواحد..... بس امتل رہنے دینا، دیوی نہ بنانا۔" اس نے جیسے دل ہی دل میں اس سے التجا کی۔

"کس سوچ میں پڑ گئیں لڑکی؟" اسے خیالوں سے نکال کر ایک کون اس کی طرف بڑھائی جسے تھامنے میں وہ متامل تھی۔

"لے لو بھئی۔ تمہارے لیے ہی لائی تھی۔ مجھے امید نہیں کہ تم مجھے بیٹھنے کا کہو گی..... مے آئی؟" زبردستی کون اس کے ہاتھ میں تھما کر اس نے تنے کے سامنے پڑے بڑے سے پتھر پہ بیٹھنے کی اجازت مانگی۔

"شیور۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"ہاں بھئی..... اب بتا ہی دو یہ کیا مسٹری ہے..... امت الاحد یا امت الواحد..... درگا

www.zemtime.com

دیوی.....اس راز سے جلدی سے پردہ اٹھا دو ورنہ مجھے ساری رات نیند نہیں آنے والی۔" اس لڑکی نے پتھر پہ براجمان ہوتے ہی شور مچایا لیکن پھر سامنے والی کی آنکھوں میں اجنبیت کی جھلک دیکھ کر شرمندہ سی ہوئی۔

"میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اپنا نام تک نہیں بتایا اور تمہارے نام کے اسرار کو جاننے کے لیے بے تاب ہوں۔ خیر جناب میرا نام بہت ہی عظیم ہستی کے نام پر ہے۔ جو ام المومنین بھی ہیں اور خلفائے راشدین میں سے دوسرے خلیفہ کی صاحبزادی بھی۔ سمجھیں..... کیا نام ہے میرا؟" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"عائشہ!" اس کی معلومات بہت محدود تھیں۔ جس حد میں اس کی دنیا تھی، اس کے پاس اس کے احد کو اس سے دور نہیں کر پائے تھے باقی ہر سو پہرے بٹھا لیے تھے۔

"نہیں..... حضرت عائشہ تو پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق کی صاحبزادی تھیں۔ اور ان کے پیارے سے نام پہ میری بڑی بہن کا نام ہے۔ جناب میرا نام حضرت حفصہ کے نام پر ہے جو کہ حضرت عمر فاروق کی بیٹی تھیں۔" اس نے بڑے فخر سے اپنی بہن اور اپنے نام کا حوالہ دیا۔

"کتنے بختوں والے ہوتے ہیں لوگ جو یوں اپنے نام پر ناز کر سکتے ہیں فخر کر سکتے ہیں۔ کوئی مصلحت کوئی مجبوری ان کی زبان کو قید نہیں کر سکتی۔" بہت ساری حسرتیں بہت سارے رشک کے ساتھ ساتھ جاگیں۔ وہ اس بخت آور کو دیکھتی رہ گئی۔

"میں بی بی اے کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ تم سے ایک سال سینئر ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے باجی واجی کہو..... خوامخواہ عمر یاد....." وہ شروع ہونے لگی تھی کہ احتل نے چونک کر اسے ٹوکا۔

"بی بی اے..... اس کا مطلب ہے کہ اسود نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہوگا۔"

"اسود..... کون اسود؟" اس وقت حفصہ کو اسود نام کا کوئی بندہ یاد نہیں آیا۔

"آپ اسود کو نہیں جانتیں..... پھر..... لیکن یہاں تو اس کے علاوہ کوئی مجھے احتل کے نام سے نہیں جانتا۔" آخری جملہ جیسے وہ خود سے بولی۔

"اچھا تو تم ابھی تک یہ گتھی سلجھانے میں لگی ہوئی ہو کہ میں تمہیں اس نام سے کیسے جانتی ہوں۔" حفصہ ہنس پڑی۔ "جناب! یہ تمہارے نام کا معمہ ہی ہے جو مجھے تمہارے پاس لے کر آیا ہے۔ میرا روم سی بلاک میں ہے۔ مگر تمہارے بلاک میں میرا آنا جانا رہتا ہے کیونکہ میری فرینڈ کا روم وہاں ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس تنے پہ بیٹھے ہوئے اور اس بلاک میں اکثر دیکھا ہے۔ جس روم میں، میں تمہیں آتے جاتے دیکھتی ہوں وہ ہندو لڑکیوں کا ہے..... تم آئس کریم کیوں نہیں کھا رہیں۔" بولتے بولتے اس نے اسے ٹوکا تو اس نے بے دلی سے پگھلتی ہوئی آئس کریم کو اپنی زبان سے چھو لیا۔

"دوپہر میں جو تمہاری مہمان آئی تھیں، جب وہ ریسپشن پہ تھیں تو پیون اس وقت سامنے نہیں تھا جو تمہیں انفارم کرتا۔ میں ڈپارٹ سے لوٹی تو انہیں انتظار کی کیفیت میں دیکھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر وہ کسی سے ملنے آئی ہیں تو مجھے نام بتا دیں، میں اس لڑکی کو بلا دیتی ہوں۔ تو جانتی ہو، ان کے منہ سے ایک دم کیا نکلا..... امت الاحد۔"

ایک ہوک سی اس کے دل سے نکلی۔ حفصہ نے غور سے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"پھر وہ ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔ اور کہنے لگیں کہ وہ درگا دیوی سے ملنا چاہتی ہیں۔"

ایک قطرہ اس کی آنکھ سے نکل کر پگھلتی آئس کریم میں گم ہوا۔

"ان کا پہلے امت الاحد کہنا اور پھر گھبرا کر درگا دیوی کہنا مجھے بہت عجیب لگا۔ بہر حال میں نے تمہیں نیچے سے آواز دے کر بتا تو دیا کہ ریسپشن تمہاری کوئی گیسٹ ہیں لیکن تب سے اب تک تجسس نے میرا برا حال کر رکھا ہے۔ تم میری حالت نہیں دیکھ رہیں۔ بھوک لگ رہی ہے نہ ہی پیاس۔" ساتھ ہی

www.zemtime.com

کون پہ آخری وار کیا اور اس کا صفایا کر دیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ امتل کے لبوں کو چھو گئی۔

"خیر، یہ تو مذاق تھا مگر میں واقعی چاہتی ہوں امتل کہ تم مجھے سب کچھ بتاؤ۔۔ یقین کرو لڑکی، کبھی کبھار دوستوں سے شیئر کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

اس نے اس لڑکی کو لحظہ بھر غور سے دیکھا جس نے بہت جلد خود کو اس کی دوست کے عہدے پہ فائز کر لیا تھا۔ بے شک اس کی آنکھوں میں خلوص نظر آتا تھا مگر وہ اس سے اپنی زندگی کی کہانی کیسے کہہ دیتی۔ ایسی دوستیوں کی گنجائش نہ رہی تھی کبھی اس کی زندگی میں۔

"شاید تمہیں میرا اعتبار نہیں..... چلو کبھی تو کرو گی ناں اعتبار۔ پھر بتا دینا۔" اسے متامل دیکھ کر حفصہ نے اس کی مشکل آسان کی اور اٹھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے جھجکتے ہوئے تھام لیا۔

☆☆☆

"امتل مل گئی؟" حیرانگی تھی۔

"ہمیں کیوں نہیں بتایا..... ہمیں کیوں نہیں لے کر گئیں؟" شکوے بھی تھے۔

"کیسی ہو گئی ہے وہ؟" اشتیاق سب سے بڑھ کر تھا۔

صحن میں سب نے رحیمہ احمد کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ مسکراتی رہیں، سوالوں کے جواب دیتی رہیں۔ ان کے سادہ سے چہرے کی چمک بتاتی تھی کہ وہ اس وقت کتنی خوش ہیں۔

"میں تو کل ہی سوچ رہی تھی پاپی! کہ حیدرآباد میں ایسا کون سا ڈاکٹر ہے جس کو دکھانے کے لیے آپ نے چوڑیاں بھی پہنی ہیں اور کانوں میں بالیوں کے ساتھ کلیاں بھی ڈالیں۔" ارم ہنس کر کہہ رہی تھی۔ وہ مسکراتی رہیں۔

"ماں! ہمیں کیوں نہیں لے کر گئیں؟ ہم نے بھی ملنا تھا امتل آپی سے؟" گل چہرہ کا شکوہ اب کئی دن تک ختم ہونے والا نہ تھا۔

"رب نے اب ملوایا ہے تو ان شاء اللہ پھر ملیں گے۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

"اب ہم سب چلیں گے ان سے ملنے، ان کے ہاسٹل۔" گل چہرہ کی آنکھیں چمکیں۔

"پھر تو بس کروا کر ہی جانا پڑے گا..... بیٹھے رہو، سب ٹھیک ہو یہیں جنجال پورہ میں۔" مومنہ نے ڈپٹا۔

اسود مسکراتے ہوئے سب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ ماں کو ملنے والی اس خوشی میں اس کا بھی کردار رہا۔ ماں تو کل صبح ہی سب کو یہ روح افزا خبر سنانے کو بے تاب تھیں مگر اس نے ہی منع کر دیا تھا۔ پھر کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ خالصتاً ماں بیٹی کی ملاقات ہو۔

امتل کس طرح سے اسود کو ملی..... یہ پوری روئیداد سنتے ہوئے مہرتاب نے بارہا اسود کے چمکتے اور مسکراتے چہرے کی طرف نگاہ کی تھی۔

"کچھ روپ وی کڈیا اے یا او ہو جی کالی جی اے؟ (کچھ روپ بھی آیا ہے یا ویسی ہی کالی سی ہے)" پھوپھو فردوس کو اپنے سرخ و سفید خاندان میں وہ ایک سانولی سلونی سی کالی ہی لگتی تھی۔

ایسے سوالوں کے جواب رحیمہ احمد کے پاس نہ ہوتے تھے اس لیے چپ ہو رہیں۔

انجمن کا دھیان آج کام سے زیادہ اس تازہ ترین خبر کی طرف تھا۔

آج صبح ہی بھوری بھینس نے بچھڑا دیا تھا۔ اب اسے سمجھ میں نہ آ رہی تھی کہ اس گھر سے باہر نکلتے ہی کون سی خبر عام کرنی ہے۔ بہت ذہن لڑانے کے بعد سمجھ میں آیا کہ رحیمہ پاپی کی بچھڑی بیٹی کے مل جانے کی خبر میں زیادہ دم ہے۔ اس کی ماں پینو خوش ہو جائے گی جو اکثر آہیں بھر بھر کر چوہدری احمد یعقوب کی بیٹی کا ذکر کیا کرتی تھی۔

www.zemtime.com

"احتل یونیورسٹی پہنچ گئی اور ہم گھر بیٹھے ہیں۔ جب پڑھنے کا نام لو، مشورہ مل جاتا ہے بی اے کرلو۔" وہاں مومنہ کے اپنے دکھ شروع ہو گئے تھے۔۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا یونیورسٹی میں پڑھنے کا یاسر اور اسود کی طرح۔ مگر اسے اجازت نہ ملی تھی۔

"اکیلی لڑکی کو کیسے بھیج دیں یونیورسٹی۔" امی کے اعتراض ہی روڑے پتھر تھے اس کی راہ میں۔

"تو اس جنجال پورہ کو بھی ساتھ لے جاؤں کیا؟" وہ پاؤں پٹختی۔

"اور کوئی نہ سہی، میں تو ساتھ جاؤں گی۔"

"امی! یاسر بھائی اور اسود بھائی کے ساتھ تو آپ نہیں گئیں؟"

"وہ تو لڑکے ہیں۔ اکیلے رہ سکتے ہیں۔ بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی میں۔"

"پھر ایسا کریں، چوہدری نگر کی ساری عوام اور بھینس گائیاں بھی ساتھ لے چلیں۔" وہ چڑ کر کہتی تھی مگر آج اس نے بڑے پیار سے امی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

احتل ہے ناں۔ میں اکیلی کیسے ہوں گی۔"

آمنۃ الاحد ان کی زندگی میں ایسے لوٹ آئی تھی جیسے گئی ہی نہ تھی۔ رحیمہ احمد ہلکا سا مسکرائیں۔

"ہیں؟ احتل؟ پراء تے تیرا پلا ویٹھا، پیو نال کی سلوک کیتا سی اس بنیے نے ..... توں وی پیلاں پاندی پھیر دی ایں۔ (بھائی تمہارا تو بھلا بیٹھا کہ باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھے اس بنیے نے۔ تم بھی جھوم رہی ہو۔" پھوپھو فردوس نے بھتیجی کو گھورتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہاں تو اس کے باپ نے کیا تھا ناں جو بھی کیا۔ وہ تو مر گیا۔ احتل کا کیا قصور۔ اب ہم اس کو سزا دیں کیا؟" سامنے بھی مومنہ تھی، پھوپھی سے زیادہ تیکھا لہجہ تھا اس کا۔

"ناں ناں تیے ..... سزا ناں دو۔ پھولاں دے ہار پاؤ اودے گل چے۔ جو دیکھنا رہ گیا، اُوی دیکھ لو۔ (نہ بیٹی ..... سزا نہیں دو بلکہ پھولوں کے ہار ڈالو اس کے گلے میں۔ جو دیکھنا رہ گیا، وہ بھی دیکھ لو)۔" پھوپھو فردوس نے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ ہلا کر کہا اور پیروں میں جوتی پہننے لگیں۔ جو کہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ناراض ہو کر جا رہی ہیں۔

مومنہ کو بھی پرواہ بھلا۔ رفعت جہاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں روکنے کی کوشش کی۔ کچھ رباب کے آنکھیں دکھانے پہ، کچھ سمدھن کی منت سماجت پہ وہ دوبارہ بیٹھ گئیں چارپائی پہ۔ رحیمہ احمد خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اسود بھی باہر نکل گیا۔

☆☆☆

نہر میں نہاتی ہوئی بھینسوں کی پیٹھ پہ ننگ دھڑنگ بچے شاہانہ انداز میں یوں اکڑ کر بیٹھے تھے جیسے راجہ مہاراجہ اپنے ہاتھیوں پہ رونق افروز جشن فتح مناتے ہوں۔ کئی بچے تیراکی کا شوق پورا کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کی نظر اس پہ پڑی۔

"رامو۔" وہ چیخا۔

اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، ہلکا سا مسکرایا، ہاتھ ہلایا اور پھر سیدھ میں چلنے لگا۔

سامنے بکھرے رنگ برنگے آنچلوں پہ اس نے یہ ایک نظر ڈالنے کی زحمت بھی نہ کی۔ مگر ان آنچل والیوں نے لمحہ بھر کپڑوں کو دھونا پیٹنا چھوڑ کر اچھی طرح سے اس اچھے (سفید) کپڑوں والے کا جائزہ لیا۔ کچھ سرگوشیاں ہوئیں اور پھر سب اپنے کام میں مصروف۔ لیکن دھانی آنچل والی کی نگاہ نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ دل تو مچلا کہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے جائے اور اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر چند لمحوں کے لیے ہی سہی اس کے ہر نقش کو غور سے دیکھ کر ازبر کر ڈالے۔ ساتھ ہی اتنے ماہ بعد شکل دکھانے کا شکوہ بھی کر ڈالے۔ مگر سامنے بیٹھی اس کی ماں اس کے اس عمل میں مانع تھی۔

رامو نے نہر کے اطراف بنی صاف ستھری کچی سڑک سے اتر کر اپنا رخ اس جانب کر لیا جہاں کو لہیوں کی آبادی تھی۔ اس کے قدموں میں واضح تیزی

www.zemtime.com

آ گئی۔

سب سے پہلے منگل کی نظر اس پہ پڑی جو باہر بڑی چارپائی پہ موتی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ منگل کے اچھل کر اٹھنے پہ موتی بھی چوکنا ہو کر اٹھا۔ منگل اپنی ماں کو اطلاع دینے کے لیے اندر کی جانب لپکا لیکن پھر رامو کے ہاتھ میں موجود بڑے بڑے تھیلے دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گیا کہ اندر اپنی ماں کو اس کی آمد سے متعلق مطلع کرے، رامو سے ملے یا پھر اس کے ہاتھ سے وہ تھیلے اپنی تحویل میں لے جن میں شہر کی جانے کیا کیا سوغاتیں تھیں۔

''راموآیورو (راموآ گیا)۔''

بالآخر اس کے قابل دماغ نے مشورہ دیا اور وہیں سے بلند آواز میں صدا بلند کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر اس کے بائیں جانب آیا جس ہاتھ میں اس نے وہ تین تھیلے پکڑے ہوئے تھے۔ اتنی دیر میں اندر سے مختلف رنگوں کے مختلف عمروں کے بچوں کا جم غفیر امڈ آیا جو اس کے چاچے پھوپھیوں کے بچے تھے۔ وہ اس کے ارد گرد یوں جمع ہوئے جیسے میٹھے کے گرد بھنبھناتی مکھیاں۔ منگل اس کے مزید نزدیک ہوا۔

رامو نے مسکراتی نظر ان سب پہ ڈالی اور مٹی دھول میں اٹے ان بچوں کے ساتھ ہاتھ ملا کر نرم لہجے میں ان کا حال چال پوچھنے لگا۔ جس بچے نے شلوار پہن رکھی تھی اس نے قمیص پہننے کا تکلف نہ کیا تھا اور جس نے قمیص اڑس رکھی تھی وہ شلوار کی قید سے آزاد تھا۔ ان سب کے بیچ وہ رستہ بھٹک کر ادھر آ نکلنے والا کوئی راج کمار ہی تو لگ رہا تھا۔ وہ بنا گھن کھائے بنا بے زاری دکھائے ان میں گھل مل گیا۔ اتنی دیر میں کملا کاکی اپنے نومولود بچے کو کمر میں دبائے نمودار ہوئی اور والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ وہ ان کی جانب لپک کر ان سے ملا او پھر ان کی اوڑھنی سے جھانکتے بچے کے گالوں پہ پیار کیا۔ وہ لڑکا تھا کہ لڑکی یہ وہ بھول گیا کیونکہ اس بچے کی پیدائش سے اگلے روز اسی کاکی کی لڑکی کے گھر بھی ولادت ہوئی تھی۔ اس لیے اسے یاد نہ رہا کہ کس کے گھر بیٹا ہوا تھا اور کس کے گھر بیٹی۔

کملا کاکی اسے بچوں کے جھرمٹ میں لے کر گھر کی طرف بڑھی۔

''اماں کدھر ہے؟'' وہ مزید صبر نہ کر سکا اور باڑھ پار کرتے ہی سوال کیا۔

''پھٹی (کپاس) چننے گئی ہے۔''

اس پل رام کولہی کے اندر ڈھیروں تھکن اتر گئی۔ یہ تھکن ڈھائی گھنٹے بس کے سفر اور دو کلو میٹر پیدل چل کر آنے کی نہ تھی۔ یہ وہ تھکن تھی جو پورا دن بے زبان جانور کی طرح جتنے پہ اس کی ماں کی بوڑھی ہڈیوں میں اتری ہوگی۔

''کدھر؟'' تھیلے کاکی کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا۔ جواب ملتے ہی وہ پلٹا اور تیز قدموں کے ساتھ ان زمینوں کی طرف بڑھنے لگا۔

سورج کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ دھوپ ماند پڑ رہی تھی، گلابی شام اترنے والی تھی مگر رام کولہی کو لگ رہا تھا کہ ان کی زندگیوں میں انگارے اگلتی قہر برساتی دھوپ ٹھہر گئی ہے۔

نہر کنارے بیٹھی دھانی آنچل والی نے ایک بار پھر اس کے اٹھتے قدموں کو گنا۔

کپاس کے پودے پہ جھکی اس کی ماں اسے دیکھ نہیں پائی۔ اس نے پیچھے سے جا کر اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے۔

''رامو..... یارو ڈیکرو (میرا بیٹا)'' یہ خوشبو بھلا کسی اور کی ہو سکتی تھی جو اس کے بیٹے کے وجود سے اٹھتی تھی۔

رامو نے مسکراتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ گنگا نے اس کا چہرہ اپنے گہرے سانولے ابھری ہڈیوں والے ہاتھوں میں تھاما اور کتنی ہی دیر تک اسے تکتی رہی۔ رامو نے اس کے کانپتے لرزتے وجود کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے بالوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ پسینے، دھوپ اور مٹی نے اس کے جسم میں عجیب سی بو پیدا کر دی تھی اسے وہ بھی مشک

www.zemtime.com

محسوس ہو رہی تھی جس کے لیے وہ مہینوں ترستا تھا۔

اس کی برادری کی عورتیں اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے گرد جمع ہونے لگیں۔ وہ ان سے ملنے لگا۔

گنگا نے اپنی پشت پہ بندھی چادر کھولی۔ جس میں روئی چن چن کر ڈالی گئی تھی۔ اس نے اس چادر میں جمع شدہ محنت کو روئی کے اس پہاڑ پہ پھینکا جو اس نے دن بھر خون پسینہ بہا کر کھڑا کیا تھا۔ جس کا ڈھیر جتنا بلند ہوتا اس کو اتنی اجرت ملتی۔ ملتی بھی یا نہیں، یہ بھی پکا کب تھا۔ شاید وہ اجرت ان کے نسل در نسل چلتے قرضے کے سمندر میں کہیں غرق ہو جاتی۔

گنگا نے پاس کھڑی عورت کو اپنی جمع کی ہوئی روئی سے متعلق چند ہدایات دیں اور بیٹے کے ساتھ چل دی۔ نہر کے پل کے قریب پہنچ کر رامو نے اس کا ہاتھ تھاما اور دو ڈھائی فٹ چوڑا وہ پل اس کے پیچھے پیچھے پار کرنے لگا۔ جس پل کو وہ ہر روز کانپتے کانپتے بنا نیچے بہتے پانی کی طرف دیکھے "رام رام" کرتی پار کیا کرتی تھی آج رام کے مضبوط ہاتھوں میں ہاتھ دیے متوازن قدموں سے اسی پل پر چل رہی تھی۔

دھانی آنچل غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"اور یہ تیرے لیے بھاگن۔" رامو نے ہار بندے اور کلپ نکال کر اپنے چھوٹے کاکا کی لڑکی کی طرف بڑھائے جو چارپائی کے پائے سے لگ کر کھڑی سلیقے سے سر پہ جمائی گئی اوڑھنی کا پلو دانتوں میں دبائے شرمائی سی کھڑی تھی۔ رامو کے ہاتھ میں ان چیزوں کو دیکھ کر مزید شرما گئی اور ساتھ والے بچے کو ٹھوکا دے کر رامو سے وہ چیزیں پکڑ لینے کا اشارہ کیا۔

"نہیں ..... تم خود لو۔" رامو نے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ شرماتی ہوئی سرخ چہرے کے ساتھ اس کے قریب آ گئی اور جھکی نظروں کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ رامو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ بال تمہارے کس نے بنائے ہیں؟" اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی دو چوٹیوں میں سے ایک کو تھام کر پوچھا۔

"اماں نے۔" اس نے یونہی نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

رامو اسے تنگ کرنے کے لیے اور سوال پوچھنے لگا وہ ویسے ہی جھجکتی شرماتی رہی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ گھر میں کوئی بھی آ جاتا، وہ شرمائی گھبرائی اوڑھنی کا پلو دانتوں میں دبائے سب سے پیچھے بیٹھی رہتی اور گاہے بگاہے مہمان پہ یوں نظر ڈالتی کہ چوری پکڑی نہ جائے۔ سامنے سے ہٹتی بھی نہیں کہ مہمان اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ رامو مہمان تو نہ تھا مگر پھر بھی مہینوں بعد دو چار دنوں کے لیے آنا اسے مہمان ہی بنا دیتا تھا۔

بچے معمولی تحفے پا کر یوں خوش تھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت ان کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ رامو کے ہاتھ میں اگر اس دولت کی کنجی ہوتی تو اسے بھی ان سب پہ لٹانے میں تامل نہ کرتا۔

"رامو! تیرے کو خبر ہے ویرو لاڈو (دولہا) بن کر کیا تو کیسا لگ رہا تھا۔" منگل نے اپنا تحفہ پا لیا تو خبرنامہ نشر کرنے کا دھیان آیا۔ "اتنا بڑا نوٹوں والا ہار پہنا تھا اس نے۔" اس نے اپنے سر سے لے کر پیر کی طرف اشارہ کیا۔ اس ہار کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آج بھی چمک آئی۔ رامو ہلکا سا مسکرایا۔

"رامو! خبر ہے اس کی لاڈی (دلہن) کے وار (بال) یہ....." ہار کی لمبائی چوڑائی سے نکل کر منگل دلہن کی زلفوں کی لمبائی گہرائی تک آیا جب رامو نے اس خبر میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی تو وہ اس کے مزید قریب ہوا۔

"رامو! خبر ہے..... رادھا کاکی پیٹ (امید) سے ہے۔" اس نے سنسنی پھیلانے والے انداز میں یہ خبر دی تو رامو اسے گھور کر رہ گیا۔

پہلے پہل تو وہ ان چھوٹے بچوں کے منہ سے ایسی باتیں سن کر سن ہو جاتا تھا۔ جو نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جہاں نہ ٹی وی جیسی عیاشی میسر تھی۔ انگوٹھا

www.zemtime.com

ریڈیو بھی بابا کے قبضے میں رہتا۔ پھر ان بچوں نے یہ باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیں۔ ان کی بے باکی کی وجہ کیا ہوئی؟ ان کی معصومیت گھائل کہاں ہوئی۔

اب وہ سمجھنے لگا تھا۔

''کتنی بار کہا ہے فضول باتیں مت کیا کرو۔''

رامو نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

''کوڑ (جھوٹ) تھوڑی اے۔'' اس کی پیچھے سے آواز آئی۔ ''بھلے کاکی سے خود پوچھ لے۔''

رامو سر تاسف میں ہلاتے ہوئے اس کونے کی طرف آیا جہاں اس کی ماں اس کو کھانا کھلانے کے بعد اب کھلے آسمان تلے اس کے لیے چائے پکا رہی تھی۔ آج اس کے پیروں میں ایروسوفٹ کی چپل تھی جو اس کا بیٹا لایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی خواہش پر اس نے وہ چپل پہن تو لی ہے لیکن اس کے واپس جاتے ہی اسے دھو دھا کر مومی لفافے میں ڈال کر رکھ لے گی اور پھر کہیں آنے جانے کے لیے ہی صندوق سے نکالے گی۔

''بابا شہر سے کب لوٹے گا؟'' پیڑھی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''خبر (کیا معلوم)'' اس نے تھکا ہوا سا جواب دیا اور بکری کے دودھ سے بنی چائے صاف ستھرے کپ میں اس کے سامنے رکھ دی۔

رامو کو بکری کے دودھ کی چائے پسند نہ تھی مگر اس نے کبھی یہ بات اپنی ماں پہ ظاہر نہ کی تھی ورنہ وہ یہ سوچ سوچ کر اپنی جان ہلکان کر لیتی کہ اپنے بیٹے کے لیے بھینس کا دودھ کہاں سے، کس سے مانگ کر لائے۔

''میں ساون اور ویرو سے مل کر آتا ہوں۔'' اس نے بہت مشکل سے چائے کا کپ ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''جلدی آنا واپسی۔'' ماں کی ہدایت پہ اس نے سر ہلایا اور وہ پیکٹ لے کر باہر نکل آیا جو وہ ویرو کے لیے لایا تھا۔ ابھی اس رامو کو منانا بھی تھا کہ اس کی شادی میں نہ آپایا تھا۔

''رامو..... رامو۔'' منگل اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔ خبر نامے کا بقیہ حصہ نشر کرنا مقصود تھا۔

''رامو..... چاچا رابطو بیٹری والی ٹی وی لایا ہے۔''

وہ کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر چلتا رہا۔

''رامو! ہمارے گھر ٹی وی کب آئے گی؟''

اب کے وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پایا۔ مڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ کیسی محرومیاں، کیسی حسرتیں رقم تھیں اس کے چہرے پہ۔

''جلدی۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

منگل کی بجھی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ چمک اس کے اپنے باپ یا بھائی کے دلاسے پہ کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ رامو جو کہتا ہے وہ کرتا ہے، اس یقین نے یہ جوت ان آنکھوں میں جلائی تھی۔ وہ ننگ دھڑنگ آوارہ گردی کرتے بچوں کو یہ خبر سنانے بھاگ گیا۔

رامو تھکے تھکے قدم اٹھاتا ویرو کی طرف آ گیا۔ پتا چلا کہ وہ تو امرود کے باغ سے پار والی زمین پہ ٹریکٹر چلا رہا ہے۔ وہ بھی اسی طرف چل پڑا۔

شام جا رہی تھی۔ رات نے اندھیرے بکھیرنے کی ابتدا کر دی تھی۔ ٹھنڈی سرسراتی ہوا نے طبیعت پہ خوش گوار اثر ڈالا۔

ایک مٹکا سر پہ اٹھائے دوسرا بغل میں دبائے دھانی آنچل والی یک دم اس کے سامنے آئی تھی۔

''رامو! کیسا ہے تو۔ اتنے دن بعد کیوں آیا؟''

''ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو حوراں؟'' اس کی جذبے لٹاتی آنکھوں سے نظریں چرا کر اس نے پوچھا۔

''کیسی ہوگی حوراں تیرے بغیر؟'' سوال پہ سوال آیا۔

رامو نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو شاید ابھی چودہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ مگر بے باکی.....

اس نے اب اس پہ بھی حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

''یہ تو میرے لیے لایا ہے۔'' حوراں نے اس

www.zemtime.com

کے ہاتھ میں موجود پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں..... ویرو اور ساون کے لیے۔"
"میرے سے بھلے بھاگ تو ساون اور ویرو کے ہیں۔" حوراں نے منہ بنایا۔ وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔
دھانی آنچل والی نے ایک بار پھر اس کے قدم گننا شروع کر دیے۔

☆☆☆

حفصہ سے اس کا پھر کئی بار سامنا ہوا۔ کبھی میس میں، کبھی پوائنٹ پہ چڑھتے اترتے، کبھی کینٹین میں یا یونہی آتے جاتے کاریڈورز میں نظر آجاتی۔ وہ اسے دیکھ کر ایک مسکراہٹ ضرور دیتی تھی اور کبھی ہاتھ بھی ہلاتی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کرتی تھی مگر اس دن جو آئی بی اے میں ہوا، وہیں سے ان کی دوستی کی باقاعدہ شروعات ہوئی۔
اس دن وہ پہلی کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد اسود سے ملنے آئی بی اے چلی آئی۔ اسود تو اسے نظر نہ آیا مگر راجیو رائے ضرور نظر آگیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکی۔
وہ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹکی۔
راجیو مہران یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کر رہا تھا۔ وہ اس سے ملنے بھی آیا تھا دو تین بار۔ مگر وہ یوں آئی بی اے میں نظر آسکتا ہے اسے، سوچا نہ تھا۔
دھکے، گالیاں، تھپڑ، لاتیں..... اس نے چند ہی پلوں میں چشم تصور میں کیا کچھ نہ دیکھ لیا تھا۔
کانپتی ٹانگوں میں اتنی جان بھی نہ رہی کہ وہ فوراً پلٹ جاتی۔ اسی اثنا میں راجیو کی اس پہ نظر پڑ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے حیران ہوا پھر دوستوں سے ایکسکیوز کر کے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔
"درگا....."
وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔
"what a coincidence" (کیا اتفاق ہے) وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔
اس کا چہرہ یوں پھیکا پڑا جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔
"تم..... یہاں؟"
اس کے پاس اپنے وہاں ہونے کی جو توجیح تھی وہ کبھی مر کر بھی بیان نہ کر سکتی تھی۔ اب عالم یہ تھا کہ وہ مڑ کر بھاگ سکتی تھی نہ ہی سچ بتا سکتی تھی۔ اسی پل اسے سیڑھیاں اترتی حفصہ نظر آئی تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور حفصہ شاہد اس کی دوست بن گئی۔
"میں..... میں حفصہ سے ملنے آئی تھی۔"
"حفصہ؟" راجیو نے سوالیہ انداز میں نام دہرایا۔
"میری دوست ہے۔"
"خوب صورت ہے؟"
اس سوال پہ وہ بھونچکا رہ گئی۔ اسے راجیو سے ایسی بات یا ایسی بے تکلفی کی امید نہ تھی۔ راجیو قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
"یار! لڑکیوں سے ملنے کا میں کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ چلو پھر ملتے ہیں تمہاری دوست سے۔"
"آں۔ ہاں۔" اس نے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھا اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔
اسی دوران کسی لڑکی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی حفصہ قریب آچکی تھی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ اور دیکھ کر مسکرائی بھی اور ہاتھ بھی ہلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب سے گذر جاتی، امتل نے پکار لیا۔ حفصہ حیران ہو کر رکی۔ اور پھر ساتھ والی لڑکی سے کچھ کہتی ہوئی ان دونوں کی طرف آئی۔
"حفصہ میں..... میں تم سے ملنے آئی تھی۔ یہ راجیو ہے..... راجیو، یہ حفصہ ہے میری دوست۔"
راجیو نے "ہائے" کرتے ہوئے ایک ہی نظر میں اس کا جائزہ لے ڈالا۔ اور خاصا مایوس ہوا۔
سادہ سا چہرہ..... شلوار قمیص پہ سلیقے سے لیا ہوا دوپٹہ۔

www.zemtime.com

ایسی شریف لڑکیاں اس کے کام کی نہ تھیں۔

"ہائے۔" حفصہ پوری صورت حال تو نہ سمجھ پائی مگر اتنا ضرور جان گئی کہ اسے اس وقت زرد پڑتے چہرے والی لڑکی کی دوست کا رول نبھانا ہے۔ بس پھر کیا تھا، اس کے اندر ایسی اداکارہ جاگ اٹھی جس کو موقع ملتا تو بین الاقوامی نہ سہی، قومی نہ سہی کوئی علاقائی ایوارڈ تو ضرور ہی مل جاتا۔

راجیو امت الاحد سے چند باتیں کر کے جلد ہی چلا گیا تھا۔

اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ممنون نظروں سے حفصہ کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"دوست کے پاس آئی ہو تو چلو چائے شائے پلاؤں۔"

"ابھی نہیں..... شام میں۔"

اس نے سوچ لیا تھا کہ ہاسٹل جا کر وہ اس سے ملے گی۔ اسے کسی طرح بات بنا کر اپنی پوزیشن کلیر کرنی تھی۔ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی پری سج سنور کر ہاسٹل سے باہر نکل جاتی اور واپسی آٹھ بجے ہی ہوتی۔ اور آج ابھی تک بیڈ پہ پڑی تھی۔ امتل بار بار موبائل میں وقت دیکھتی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ کب پری جائے اور وہ جا کر حفصہ سے ملے۔

ہاسٹل میں رہنے والی باقی ہندو لڑکیاں نا صرف بغیر کسی روک ٹوک کے مسلمان لڑکیوں سے بات کرتی تھیں، بلکہ دوستی بھی کر سکتی تھیں۔ ایسی پابندیاں صرف اسی کے لیے تھیں اور وہ جانتی تھی کہ کیوں۔

پری اسکول اور کالج میں بھی اس کی سینئر رہی۔ اس کو جاسوسی کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ اسکول و کالج میں وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بات بھاؤ یا ممی تک پہنچا دیا کرتی تھی۔ اب تو جگدیش مہیشوری نے خاص طور پر اس کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

اس لڑکی نے ہمیشہ اسے زک پہنچائی تھی۔ اسے یاد تھا جب وہ اسکول میں ایک درخت تلے بیٹھ کر اپنی ہم جماعت اقراء کو سورہ فاتحہ سنا رہی تھی۔ اس کے ارد گرد دو تین اور لڑکیاں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ ایک ہندو لڑکی قرآن کی تلاوت کر رہی ہے۔ ان میں سے کسی نے مزید دو چار کو آواز دے کر بلا لیا۔ یوں جب سورت سنا کر اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو اس کے ارد گرد جمگھٹا سا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔

"تمہیں یہ سورت کس نے سکھائی؟"

"تمہیں عربی پڑھنی آتی ہے؟"

لڑکیاں حیران تھیں اور متجسس۔

"میں نے اپنی ماں سے سیکھا ہے۔" وہ مسکرا مسکرا کر جواب دیتی رہی۔

"تمہاری ماں مسلمان ہے؟" مزید حیرانگی سے سوال ہوا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس دن جب وہ گھر لوٹی تو بہت خوش تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ آج اس کے دل کے تار پیچھے کہیں جا ملے ہوں۔

شام کو بھاؤ کرکٹ کھیل کر گھر واپس لوٹا تو فون بج رہا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ پانچ منٹ بعد جب اس نے فون رکھا اور ہاتھ میں پکڑا بلا لہراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو وہ سہمی۔

اس کا بھاؤ آج تک اس کی طرف پیار سے تو نہ بڑھا تھا۔ جب بھی وہ اس کے قریب آیا تھا، جارحانہ انداز میں ہی آیا تھا۔

"تم نے اسکول میں آج قرآن پڑھا؟" وہ کوئی بہت بڑا نہ تھا مگر اس کے ساتھ اس کا رویہ، اس کا لہجہ سخت گیر باپ جیسا ہوتا تھا۔

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

"پوچھ رہا ہوں میں کچھ تم سے..... جواب دو۔" بھاؤ نے اس کے بال پکڑ کر پیچھے کو کھینچتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں تکلیف اور ڈر کے مارے

www.zemtime.com

آنسو آنے لگے۔ بھاؤ پہ کبھی اس کے آنسو اثر انداز نہ ہوئے تھے۔ ابھی بھی اس نے اس کی پونی چھوڑی نہیں۔

"بولو....."

"جی۔" اس کے منہ سے نکلا۔

بھاؤ نے اس کے بال چھوڑ کر اس کے منہ پہ زوردار تھپڑ مارا تھا اور کچھ گالیاں بھی دی تھیں۔ ایسے وقت میں اسے سرمئی گیٹ والا بڑا سا گھر یاد آتا، جہاں سفیان بھاؤ رہتے تھے اور اسے کبھی نہیں مارتے تھے۔

"تم نے اسکول میں یہ کہا کہ ممی مسلمان ہیں؟"

"میں..... میں نے کہا تھا کہ ماں مسلمان ہیں۔" وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

بھاؤ نے اس کے جملے کا تجزیہ کرنے میں وقت ضائع نہ کیا اور بہن کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔

کتنی توہین کی بات تھی اس کے لیے کہ اس کی بہن قرآن پڑھتی ہے، اپنی ماں کو مسلمان کہتی ہے۔ کیا سوچتی ہوگی پری، موہن اور اوم کو پتا چلتا تو کتنا مذاق اڑاتے وہ اس کا۔ اور شوبھا..... وہ تو شاید اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیتی۔

آخری سوچ زیادہ حاوی رہی۔

نوعمری کا پیار جان لینے اور دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ شوبھا کو کھونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا بیٹ اس پہ برسانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخیں ممی کے کانوں تک پہنچیں تو وہ بھاگ کر پہنچیں مگر جب تک وہ اتنا مار چکا تھا کہ وہ زمین پہ گٹھری کی صورت پڑی تھی۔ ممی کو دیکھ کر بھی وہ باز نہ آیا جب تک کہ ممی نے بیٹ اس کے ہاتھ سے کھینچ نہ لیا۔

"شرم نہیں آتی تمہیں بہن کو مارتے ہوئے۔" ممی نے بیٹ پرے پھینکتے ہوئے بھاؤ کو تھپڑ مارا اور اسے زمین پہ سے اٹھانے کے لیے جھکیں۔ وہ اٹھ نہ پائی۔

بھاؤ نے گال پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شعلہ بار نگاہوں سے ممی کو اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے دیکھا اور رستے میں پڑی ہر شے کو ٹھوکر مارتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔ رات کو اس کی پیشی ڈیڈی کے سامنے ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے اسے تین تھپڑ مارے تھے۔ اس نے پھر نفرت کے ساتھ بہن کی طرف دیکھا جو ماتھے اور بازو پہ پٹی باندھ کر بیٹھی تھی۔ وہ غلط کر کے بھی ممی اور ڈیڈی کی نظر میں چھوٹی تھی، مظلوم تھی، معصوم تھی۔

"یہ..... یہ آپ کی لاڈلی..... اسکول میں مسلمان لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرتی ہے، انہیں قرآن سناتی ہے اور..... اور کہتی ہے کہ مسلمان ماں کی بیٹی ہے۔" جگدیش کو ممی ڈیڈی کے سامنے ثابت کرنا تھا کہ ان کی بیٹی چھوٹی ضرور ہے مگر اتنی بھی مظلوم نہیں، اتنی بھی معصوم نہیں..... اور وہ کامیاب رہا تھا۔

ممی کے ہاتھ سے گلاس چھوٹا اور ڈیڈی کتنی ہی دیر ساکت کھڑے رہے۔

اس دن کے بعد سے اس کے لیے شدھی چلائی گئی۔ یوں تو ہندوستان میں یہ "شدھی تحریک" دوسرے مذاہب کے پیروکاروں خاص طور پر مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے چلائی گئی تھی۔ مگر یہاں عمرکوٹ میں رام مہیشوری اور گائتری دیوی کو اپنی ہی بیٹی کے لیے شدھی چلانی پڑی۔ وہ جو سمجھ رہے تھے کہ وقت کے ساتھ خود بخود سب ٹھیک ہو جائے گا، اس دن کے بعد سے اس غلط فہمی سے نکل آئے۔

بھارت سے خاص طور پر گنگا جل منگوا کر اس کا اشنان کروایا۔ سانگھڑ، عمرکوٹ، اسلام کوٹ کے ہر چھوٹے بڑے مندر میں ماتھا ٹیکنے کو لے گئے۔ گھر میں کئی قسم کی پوجا رکھوائی گئی۔ رشتے دار، دوست احباب جس نے جو مشورہ دیا، اس پہ عمل کیا۔ اور پھر انہیں لگنے لگا کہ وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

ان کی بیٹی نے نماز پڑھنی چھوڑ دی، ان کی بیٹی نے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا، ان کی بیٹی اپنا نام "دُرگا دیوی" بتانے لگی۔

"پری! باہر فہد کھڑا ہے، تمہیں بلا رہا ہے، تم اس

www.zemtime.com

کا فون بھی نہیں لے رہیں۔"

سنتوشی جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی، اس کی آواز نے اسے چونکایا۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے وہ ماضی کے ایک تکلیف دہ باب سے باہر نکلی۔

"کرتا رہے انتظار۔" پری کروٹ بدلتے ہوئے بے زاری سے بولی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ آج شام ہاسٹل سے باہر گزارنے والی نہیں۔ یہ لڑکی بھی ناں..... جونک ہے پوری۔

اس نے اکتاہٹ سے سوچا۔ اس شام جب جگدیش مہشوری نے اسے بیٹ کے ساتھ پیٹا تھا، تب تو اسے علم نہ ہو سکا کہ اس تک یہ بات پہنچی کیسے۔ مگر آہستہ آہستہ اس پہ کھلنے لگا تھا کہ پری اس کی شکایتیں لگاتی ہے، کبھی بھاؤ سے کبھی ممی سے۔ کالج میں اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ باقاعدہ اس پہ نظر رکھتی ہے اور اسے یقین تھا کہ اب وہ یہ کام پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ کرتی ہوگی۔

اس شام وہ حفصہ سے ملنے نہ جا سکی تھی۔

☆☆☆

"غلاف چڑھا لیا کرو انہیں۔"

امی کی آواز مومنہ کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی مگر سب کو حیرت تب ہوئی جب امی کو پلٹ کر جواب دینے کے بجائے وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ امی کا اگلا ڈائیلاگ تھا "یہی تمیز سکھاتے ہیں تمہیں یہ رسالے کہ ماں کو آگے سے جواب دو۔"

افسوس..... صد افسوس انہیں یہ ڈائیلاگ ادا کرنے کا نادر موقع نہ ملا۔ دوسری طرف مکمل چپ محسوس کر کے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اس کی صورت دیکھی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

"ناں تو کیا ہوا۔ ماں نہیں مر گئی تمہاری۔ رسالہ ہی تو پھٹا ہے۔" امی کو مزید غصہ آیا۔ اندر ولی ارم سے دو تھپڑ کھا کر حلق پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا، باہر یہ سوگ منانے بیٹھی تھی۔

مومنہ کے آنسوؤں میں مزید تیزی آئی۔

سلسلے وار ناول جس کی قسط کا پورا مہینہ انتظار کیا، وہ ابھی پڑھ بھی نہ پائی تھی کہ ولی نے ڈائجسٹ کی آخری رسومات ادا کر دیں۔ چہرہ تک ٹھیک طرح سے دیکھنے نہ دیا اور امی کہہ رہی تھیں کہ "رسالہ ہی تو پھٹا ہے۔" اب امی کو کیا پتا کہ اس کا دل پھٹ کر رہ گیا۔ اس قسط میں تو ہیرو نے ہیروئین کی غلط فہمی دور کرنی تھی۔ پھر شاید محبت کا اقرار بھی اسی قسط میں کرتا۔

یہ نصاب کی کتابیں تو نہ تھیں، ارم کے بچے پھر بھی جانے کیوں ان کے دشمن تھے۔ آج تو حد ہی ہو گئی۔ جب جب سر منہ اور کھال کے بنا والا ڈائجسٹ لیے کمرے سے برآمد ہوئی تو مومنہ کا ماتھا ٹھنکا۔ فوراً اس کے ہاتھ سے رسالہ لے کر دیکھا۔ رسالہ اسی مہینے کا تھا اور کارروائی ہو چکی تھی۔ اندر سے بوکھلائی ہوئی عروہ برآمد ہوئی۔

"ولی کے حلق میں کاغذ پھنس گیا۔ اسے سانس نہیں آ رہا۔" باقی سب کمرے کی طرف بھاگے اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چاچی کے تینوں نمونوں کا سانس کھینچ لے۔ یہ ڈائجسٹ اس نے اپنے پیسوں سے منگوایا تھا اور اطہر صاحب نے رشوت تو جو لی سو لی، رسالہ سامنے کھڑی ارم کے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا تھا۔ اور اب رسالے کا یہ حشر تھا۔

"اچھا..... میں اپنی بیٹی کو اور منگوا دوں گی۔" رحیمہ احمد نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"اور ملے گا نہیں..... آتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک دن بھی لیٹ جائیں تو ملتا نہیں۔" اس کے آنسوؤں میں روانی آئی۔ یونہی تو اطہر کو رشوت نہ دی تھی۔

"اچھا ہوگا نہ ملے تو..... ان رسالوں نے ہی خراب کیا ہوا ہے لڑکیوں کا دماغ۔"

رسالہ تو پہلے ہی نیم جاں پڑا تھا۔ ورنہ چوہدرائن رفعت جہاں کے اس الزام پہ تڑپتا ضرور۔

"ارم چاچی نے خود تو کبھی پیسوں کا رسالہ منگوایا نہیں۔ ہمارا دیکھیں تو جھپٹ لیتی ہیں اور پھر

www.zemtime.com

اپنے نمونوں کو تھما دیتی ہیں۔" آنسو صاف کرتے ہوئے ارم کے کمرے کی طرف منہ کر کے اس نے اپنا غصہ اتارا۔

"تمیز تو تجھے ہے نہیں کہ بڑوں کے لیے بات کیسے کرتے ہیں..... چاچی ہے وہ تیری۔" امی کو مزید غصہ آیا۔

"ان رسالوں نے ہی کیا ہے اخلاق خراب ان لڑکیوں کا۔" ہمایوں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے سر نکالا اور پھر فوراً اندر کیا ورنہ کسی بھی شے سے حملہ ہو سکتا تھا۔

"دفع ہو جاؤ تم۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے چلائی۔

"سیب (صہیب) کی دادی آئی ہیں۔" حبہ نے اطلاع دی۔

"کون سی نئی بات ہے۔ صبح شام آتی ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"ناں..... اور آناں کوڑ کر لیے جیے..... تینوں ماں تیری مت نئیں دیندی کہ وڈیاں نوں سلام کری دا اے۔ (ادھر آؤ ناں چھپکلی..... تمہیں تمہاری ماں عقل نہیں دیتی کہ بڑوں کو سلام کرتے ہیں)۔" پھوپھو فردوس نے حبہ کا بازو تھام کر اسے روکا جو انہیں دیکھ کر بھاگتی ہوئی برآمدے میں آ گئی تھی۔ سلام تو مومنہ نے بھی نہیں کیا تھا جو سر جھکائے پتا نہیں کون سے منتر پڑھ رہی تھی۔ مگر اسے کچھ کہہ کر کچھ سننی بھی پڑتی تھیں۔ اس لیے نظر انداز کر کے وہ رفعت جہاں سے ملنے لگیں۔

"تیرے پاء پچھ رے سی۔ کدوں آنا فاطمہ دے دن تھن منڈے والیاں نے۔ اسیں ویں فیر کوئی تیاری پھڑیے (تمہارے بھائی پوچھ رہے تھے کہ فاطمہ کی شادی کی تاریخ کب رکھنے آئیں گے لڑکے والے۔ ہم بھی پھر کوئی تیاری کریں)۔" پھوپھا صادق کی بابت بتاتے ہوئے وہ برآمدے میں رکھے صوفے پہ بیٹھیں۔

"اسود نوں آیا سی فون آپا دا۔ کیہ رئی سی..... خرم نے چیت چے آنا پاکستان۔ ہفتے دس دن بعد دی رکھن گے کوئی تاریخ۔ چوہدری صاب شہر جان گے تے آپ گل کرن گے آپا نال (اسود کو آپا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ خرم اپریل کے درمیان میں آئے گا۔ ہفتے دس دن بعد کی رکھیں گے کوئی تاریخ۔ چوہدری صاب شہر جائیں گے تو آپا سے خود بات کریں گے)۔"

"اپریل..... اتنی گرمی میں کریں گے شادی؟" مومنہ نے ڈائجسٹ کے غم سے نکل کر حساب کتاب کیا اور چلائی۔

☆☆☆

"آپ لوگ ٹانگوں کے بغیر والی مرغیاں پکاتے ہیں کیا؟" حفصہ نے سامنے پڑی پلیٹ کو کاؤنٹر پہ کھسکاتے ہوئے ادا قاسم کو گھورا۔

"نہیں ادی..... ایسی بات نہیں۔" وہ منمنایا۔

"اچھا..... ہمیں تو نہ ملی ان تین سالوں میں ٹانگ والی بوٹی۔" حفصہ نے شوربے میں ڈوبی پسلی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔

"ادی! آپ لیٹ آئی ہو اس لیے....."

"اچھا..... کل سے میں پہلے آ کر بھی دیکھ لوں گی۔ ابھی تو اٹھاؤ اسے۔ مجھے سبزی دو۔"

"وہ ادی....." ادا قاسم نے کان کھجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "بھنڈی تو دو پلیٹ بچی ہے۔ وہ روم سیونٹین اور روم ون ٹین کی لڑکیوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

کمرہ ایک سو دس اور کمرہ سترہ میں ہندو لڑکیاں رہتی تھیں اور وہ مرغی، انڈا، بڑا گوشت، چھوٹا گوشت کچھ بھی نہیں کھاتی تھیں۔ سنا ہے کہ کچھ ہندو مچھلی، مرغی اور انڈا کھا لیتے ہیں مگر اس نے کم از کم آج تک ہاسٹل میں ایسی کوئی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ اس لیے میس میں اور کسی کے لیے بچے یا نہ بچے، ان کے لیے خاص طور پر سبزی رکھی جاتی تھی اور اس پہ کوئی اعتراض اور بحث بھی نہ کرتا تھا۔

www.zemtime.com

"اچھا..... چلو لاؤ ادھر..... کل سے اگر تم نے مجھے کوئی اچھی بوٹی نہ دی تو یہ شوربے والا ویگیا الٹ دوں گی تمہارا۔" حفصہ نے پرے کھسکائی ہوئی پلیٹ واپس اپنی طرف کی۔ اور اخبار میں لپٹی روٹیاں اٹھا کر پلٹی جب اس کی نظر سامنے سے آتی اس لڑکی پہ پڑی جو اس کے لیے پہیلی تھی اور بڑی دلچسپ پہیلی تھی۔

"ہائے۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"اچھا ہوا تم مل گئیں۔ یار ایسا کرو، اپنے لیے ایک پلیٹ بھنڈی تو لو۔ قسم سے میرا دل نہیں چاہ رہا یہ ڈبکیاں لگاتی مرغی کھانے کو۔" حفصہ نے بے تکلفی سے کہا۔ وہ اس کی پوری بات تو نہ سمجھی تھی مگر سر ہلا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔

حفصہ نے روم میں کھانا لے جانے کا ارادہ ترک کیا اور وہیں میس میں چاروں طرف پڑی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ ادا فیض نے اس کے سامنے کھانا لگایا تو اس نے بھنڈی کی پلیٹ حفصہ کی طرف بڑھا دی۔

"شکریہ یار۔" یہ کہہ کر وہ جو کھانا شروع ہوئی تو پھر ادھر دیکھا نہ اُدھر۔ بس کھاتی گئی۔

"میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی..... ایکچوئیلی مجھے آپ کو تھینکس کہنا تھا۔" تھوڑی دیر خاموشی سے اسے کھاتے ہوئے دیکھتا رہنے کے بعد ہتھیلی مسلتے ہوئے اس نے بات کی ابتدا کی۔

"تھینکس؟" حفصہ نوالہ چبانا چھوڑ کر وہ اس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگی۔

"وہ اس دن..... راجیو کے سامنے آپ نے میری عزت رکھ لی۔"

"عزت اللہ رکھتا ہے امت الواحد..... امت الاحد....." وہ نام میں کچھ اٹکی۔

"امت الاحد۔" اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا۔

اتنا عرصہ جو اسے کسی سبق کی طرح اس کا نام رٹوایا گیا تھا۔

درگا دیوی..... درگا دیوی..... درگا دیوی۔

وہ سبق پھر سے اسے بھولنے لگا تھا اور ممی ڈیڈی کی سب کوششیں کاوشیں دم توڑنے لگی تھیں۔

"ہوں..... امت الاحد۔" وہ پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ویسے لڑکا تھا ہینڈسم..... شکل اچھی تھی، نظر اچھی نہیں تھی..... سوری سوری..... کہیں تمہارا بھائی تو نہیں وہ۔"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" حفصہ مطمئن ہو کر منہ میں نوالہ ڈالنے لگی۔

"منگیتر ہے وہ میرا۔" سلونی لڑکی پلکیں جھپکائے ہاتھ کی لکیروں پہ انگلی پھیرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔ حفصہ کا منہ کی طرف جاتا نوالے والا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ دیر وہ اس پہیلی کو یوں ہی دیکھتی رہی۔

"سوری..... تمہارا ساری بھنڈی تو میں کھا گئی۔ اصل میں یار صبح سے ناشتا کیا ہوا ہے۔ دوپہر میں لیٹ آئی تو کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے....." وہ ماہر تھی سامنے والے کو کسی بھی موضوع پہ لانے اور کسی بھی ٹاپک سے ہٹانے میں۔

"کوئی بات نہیں..... مجھے اتنی بھوک ہے بھی نہیں۔" سانولی سلونی لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اتنی نہیں مگر بھوک ہے تو سہی ناں۔ تم ایسا کرو، یہ چکن لے لو۔" اس نے اپنی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی اور پھر دانت تلے لب دباتے ہوئے پیچھے بھی کر لی۔ "سوری تم تو چکن نہیں کھاتی ہو گی۔"

"میں کھا لیتی تھی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تھی؟" حفصہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پہیلی ابھی بھی پہیلی تھی اس کے لیے۔

"چلو پھر تم یہ کھا لو۔"

"میس کی مرغی کا ذائقہ پسند نہیں مجھے۔" اس نے بہانا بنایا۔ اور دور کہیں سرمئی گیٹ والے گھر کے بڑے سے باورچی خانے میں بنتی دیسی مرغی کے

www.zemtime.com

ذائقے کو اپنی زبان پہ محسوس کیا۔

"ہاں یار اسچ کہتی ہو۔ ہاسٹل کا کھانا ایسا ہوتا ہے کہ بندہ کھا کھا کر اتنا اوب جاتا ہے کہ گھر کے ٹنڈے بھی مزے کے لگنے لگتے ہیں۔" وہ ہنسی۔ "چلو کسی دن میں تمہیں خود چکن کڑاہی بنا کر کھلاؤں گی۔"

حفصہ شاہد واقعی دوست بننے میں اور دوست بنانے میں دیر وقت نہیں لیتی تھی۔

☆☆☆

کیسا ملوک، کیسا سجل، سوہنا بیٹا تھا اس کا۔

صورت ایسی کی سامنے والے کو اس کی کھلتی رنگت، کشادہ پیشانی، شہد رنگ آنکھوں اور جاذب نقوش کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا۔ قد ایسا کہ پیچھے کھڑا کوئی نظر نہ آتا۔ قدم اٹھاتا تو دھرتی میں دھمک سی اٹھتی۔ نظر اٹھاتا تو سارا سماں سحر زدہ سا ہو جاتا۔

ایسے بیٹے کے باپ کی گردن غرور سے اکڑ جاتی ہے۔ اس کا سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا ہے۔ باپ اس ڈر سے نگاہ بھر کر دیکھنے سے ڈرتا ہے کہ ایسے جوان اور خوبرو بیٹے کو اپنی نظر ہی نہ لگا بیٹھے۔

پر کس قدر نفرت..... کیسی شدید نفرت سے ہاتھ جھٹکا تھا اس کے باپ نے اس کا۔ اس پہ ایک نگاہ تک نہ ڈالی تھی۔ اور اپنے دوہرے ہوتے جسم پہ کاٹھیوں کا وہ بوجھ اٹھا کر چل دیا تھا جس کو اٹھانے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ گوشت سے خالی تھی۔

پہلی بار رامو نے اس کی وہ ٹانگ تب دیکھی تھی جب وہ چار پانچ برس کا تھا۔ اس دن تھکا ہارا لالو دن چڑھے تک بے خبر سو رہا تھا اور اس کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر کو اٹھتے ہوئے گھٹنوں تک چلے گئے تھے۔ رامو اس کی بائیں ٹانگ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کی پنڈلی پہ گوشت نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ران پہ بھی گوشت بہت کم ہے۔ جب لالو سو کر اٹھا تو اس نے باپ سے پوچھا تھا کہ اس کی ٹانگ ایسی کیوں ہے۔ جانے کیوں لالو نے اسے بہت مارا تھا۔ بہت گالیاں بھی دی تھیں۔

اسے لگا تھا کہ اس کا سوال باپ کو برا لگا۔ پھر آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ وہ ہی باپ کو برا لگتا ہے۔ اور کیوں لگتا ہے اس کا جواب بھی کوئی راز نہ رہا تھا۔ وقت نے سب سمجھا دیا تھا۔

"کبھی تو..... کبھی تو مجھے "مارو ڈیکرو" کہے گا تو بابا..... کبھی تو۔" اس نے دور جاتے باپ کو زیر لب مخاطب کیا جو تکلیف اور مشقت سے چل رہا تھا مگر اس نے رامو کا احسان لینا قبول نہ کیا تھا۔

رام کولہی اس کو جاتا دیکھتا رہا۔ آنکھوں کی نمی نے منظر دھندلا سا دیا تھا پھر بھی گرتا پڑتا کاٹھیوں کے بوجھ سے دوہرا ہوتا ہوا باپ نظر آتا رہا۔ ایسے کئی دیکھے، ان دیکھے بوجھ تھے جن کے تلے اس کے خاندان کا ہر فرد دبا تھا۔ پہلی سانس سے آخری سانس تک اپنا آپ مٹا کر پچھلی نسلوں کے چڑھے قرضے اتارنے اور اپنے لیے دو وقت کی روٹی کرنے کے لیے کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے۔ ساری عمر بھروتی (مکمل ادائیگی کی رسید) کے لیے گزار دیتے۔ خود مٹی ہو جاتے مٹی میں جا ملتے مگر بھروتی نہ ملتی۔

کئی برس پہلے اس کا ماما اسے شہر نہ لے گیا ہوتا تو آج اس کے تن پہ ایسا مکمل اور صاف لباس نہ ہوتا، پاؤں میں نئے جوتے نہ ہوتے، چہرے پہ جوانی کا حسن نہ ہوتا۔ آنکھوں میں اتنی چمک نہ ہوتی۔ ہاتھوں پیروں کی جلد اور ناخن اتنے صاف نہ ہوتے۔

اس کی ماں نے اپنا کلیجہ نہ کاٹا ہوتا تو وہ بھی ایسے کئی دیکھے ان دیکھے بوجھوں تلے دبا ہوتا۔ اس کی ماں نے جدائی سہہ کر اس کے لیے آزادی خریدی تھی۔ مگر کیا وہ آزاد تھا؟

ایک سوالیہ نشان اس کے سامنے ناچنے لگا۔

ایک گہرا سانس خارج کر کے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

آزاد تو یہ پنچھی تھے۔ انسان کبھی مکمل آزاد نہیں ہوتا۔ کبھی رشتے بیڑی بنتے ہیں، کبھی فرض راہ روکتے ہیں، کبھی معاشرہ قید کرتا ہے اور..... اور کبھی محبت پابجولاں کرتی ہے۔ آخری بیڑی وہ ہے جو بندہ ہنس

www.zemtime.com

کر اپنے پیر میں خود ڈالتا ہے۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"اے..... کھڑے کھڑے کھاب (خواب) دیکھتے ہو کیا؟" کسی نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ نچایا۔ چوڑیاں کلائی سے کہنی کی طرف جو گریں تو بج اٹھیں۔ اس نے چونک کر مخاطب کرنے والی کو دیکھا اور کوفت زدہ ہو کر اس کا حال پوچھا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"رامو! تیرے کو میری سک نہیں لگتی (تمہیں میری یاد نہیں آتی؟)" وہ جلدی سے اس کے سامنے آئی۔

رامو نے سنہری رنگت والی اس لڑکی کو دیکھا جس کے گال تمتما رہے تھے۔ پتا نہیں دھوپ سے یا رامو کو دیکھ لینے کی خوشی سے۔ اسے اس لڑکی پہ ترس سا آیا۔ وہ بھی بڑی شادمانی سے محبت کی بیڑیاں پہن بیٹھی تھی۔

"میں وہاں اتنا مصروف ہوتا ہوں کہ کسی کو یاد کرنے کا وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔" وہ اکھڑ یا مغرور نہیں تھا مگر اس کے ساتھ نرم لہجے میں بات کرنے کا مطلب تھا..... اس کے خوابوں میں کچھ رنگ اور بھرنا۔

"ہاہ..... ماسی کی سک بھی نہیں لگتی تیرے کو۔" اس نے حیرت سے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ گنگا ماسی کی رامو رامو کرتے سویر ہوتی، رامو رامو کرتے شام ہوتی اور رامو رامو کرتے ہی رات پڑتی۔ اور پُٹ (بیٹا) کیسا بے مروت تھا۔

"وہ میری ماں ہے، اس کی سک کیوں نہیں لگے گی۔ میری بات کا مطلب تھا کہ ہر ایرا غیرا یاد نہیں آتا مجھے۔" وہ سختی سے کہتا ہوا آگے بڑھا۔

حوراں وہیں کھڑی کی کھڑی رہی، اس کو جاتا دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں پانی بھرتا رہا۔ اور ایسا کوئی پہلی بار تو نہ ہوا تھا۔

☆☆☆

"تو آج ہمیں میزبانی کا شرف حاصل ہو ہی گیا۔" حفصہ نے الماری کے لاکر سے نیچے والے حصے میں پڑے مسالے نکالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ہاتھوں کی لکیروں کو اپنے پوروں سے مسلتی مسکرا دی۔

بہت دن سے حفصہ کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے روم میں آئے تاکہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے چکن کڑاہی بنا کر کھلائے۔ وہ آ نہ سکی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ کسی دن پورنیما، سنتوشی اور کرشنا نہ ہوں تو وہ حفصہ کے پاس جائے اور بے فکری سے وقت گزارے۔ اور آج وہ موقع مل گیا تھا۔ ویک اینڈ تھا۔ سنتوشی اپنے گھر گئی تھی۔ کرشنا سٹی (حیدرآباد کو جامشورو میں رہنے والے طلباء عام طور پر city کہتے ہیں) اپنے شوہر کے پاس گئی تھی اور پری پتا نہیں کل سے کہاں تھی۔ اس نے سنتوشی اور کرشنا کے روم سے باہر جاتے ہی بڑی آزادی محسوس کی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسود کو کال کی۔ آج وہ اس کے ساتھ کافی وقت بات کر سکتی تھی۔ اور حفصہ کا شکوہ بھی دور کر سکتی تھی۔

اسود اس ویک اینڈ گھر گیا ہوا تھا۔ وہ اداس سی ہو گئی۔

کاش! ماروی بھی اپنے ملیر جا سکتی۔ اس سرمئی گیٹ سے گزر کر اس بڑے سارے صحن میں قدم رکھنے کا حق کیا صرف اسود کے پاس تھا۔

اداسی حد سے سوا ہونے لگی تو بیڈ پہ پڑی کتاب کھولنے لگی جب اس کی نظر الماری پہ لگے پوسٹر پہ گئی۔

چار بازوؤں والی کالی ماں سرخ خون جیسی زبان نکالے ہوئے تھی۔ وہ goddess (دیوی) تھی۔

ایسے یہ دیوی دیوتا اور ان سے جڑی کہانیاں بیزار کرتی تھیں۔ اس کے کانوں میں کوئی داستان پڑتی بھی تو وہ دوسرے کان سے نکال دیتی۔ اس بات پہ مندرا پھوپھی بڑی پریشان رہتی تھیں۔

اس کا موبائل بجا تھا..... ممی تھیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ وہ ویک اینڈ پہ گھر کیوں نہیں آئی۔

www.zemtime.com

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس کی صاف گوئی پہ ممی کچھ چپ سی ہوئیں۔

"جگدیش پوچھ رہا تھا تمہارا۔"

"آپ سے کیوں پوچھ رہا تھا، اس سے کہیں، پری سے پوچھ لے۔" اس کے لہجے میں کڑواہٹ آئی۔

جن تعطیلات میں پورنیا سانگھڑ جاتی تھی، ان میں اسے گھر لازم پہنچنے کا حکم ملتا تھا جگدیش مہیشوری سے۔ اسے ڈر ہوتا ہوگا کہ پیچھے سے اس کی بہن کسی سے ملتی نہ رہے یا کہیں بھاگ نہ جائے۔

"پری کا ایکٹ میں ہے کیا اس سے؟" بھولی ماں پوچھ رہی تھی۔ "اسے پتا نہیں کہ جگدیش شادی شدہ ہے۔"

اسے جانے کیوں ہنسی آگئی۔

ممی بھی ناں..... کبھی کبھی روایتی ماں بن جاتی تھیں۔ جن کو لگتا تھا کہ لڑکیاں ہی ان کے خوبصورت جوان امیر و کبیر بیٹے کے پیچھے پڑی ہیں۔ ان کا اپنا بیٹا تو دودھ کا دھلا ہے۔

ممی سے بات کر کے اس نے وقت دیکھا۔ اور حفصہ کے روم میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ رات والا شکنوں بھرا لباس تبدیل کیا۔ سیاہ رنگ کے ٹراؤزر شرٹ کے ساتھ سفید شال نما اسٹول لیا۔ دوپٹی کی کولہاپوری چپل پہنی۔ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی گوندھی اور ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگا کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور الماری کے سامنے سے ہٹنے لگی جب اس کی نظر پھر اس پوسٹر پہ پڑی تھی۔

وہ پوسٹر سے نظر ہٹا کر باہر نکل آئی۔ اپنا روم لاک کر کے بلاک سے باہر آئی۔ حفصہ کا روم دوسرے بلاک میں تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک دی اور "کم ان" سن کر اندر داخل ہوئی۔ اندر حفصہ اور اس کی ایک روم میٹ غزل تھی۔ حفصہ اسے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی اور پھر خوش۔ اس نے اسے کرسی پیش کر کے جلدی جلدی بیڈ کی چادر درست کی، اسٹڈی ٹیبل پہ کتابوں کے ساتھ پڑے پلیٹ اور کپ اٹھا کر کھڑکی کی پچھلی طرف بنی جگہ پہ رکھے۔ اور پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑائی۔

"صبح منہ تو دھو لیا تھا، کنگھی کون کرتا۔ چھٹی ہی تو تھی۔"

جلدی سے کھڑے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھ کر بدقت مسکرائی۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"یہ تو ہندو ہے ناں؟" غزل نے حفصہ کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا لہجہ عجیب تھا۔ اور امتل کی طرف دیکھنے کا انداز بھی۔

حفصہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"میں سمیرا کے روم پہ جا رہی ہوں۔ رات وہیں رکوں گی۔" دو کتابیں اور ایک رجسٹر اٹھاتے ہوئے غزل نے حفصہ کو اطلاع دی اور اس پہ پھر وہی عجیب سی نظر ڈالتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے نکل جانے کے بعد دونوں نے سکون محسوس کیا۔ دونوں شاید ایسا ہی چاہتی تھیں۔

"تم نمک مرچ ہلکی کھاتی ہو یا تیز؟"

حفصہ کے سوال نے اسے چونکایا۔

"ہر طرح کا کھا لیتی ہوں۔"

"ہاسٹل میں رہنے والا ہر طرح کا کھانے کا عادی ہو جاتا ہے۔" حفصہ ہنسی تو وہ بھی مسکرا دی۔

پھر دونوں نے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے چکن کڑاہی بنائی۔ باتیں تو حفصہ ہی کر رہی تھی وہ سن رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

بہت عرصے بعد وہ یوں مسکرانے لگی تھی۔

پہلے اسود یوں مسکرانے کی وجہ بنا اور اب حفصہ۔

کڑاہی تیار ہوئی تو حفصہ میس سے روٹیاں لے آئی اور پھر دسترخوان لگایا۔ کڑاہی والی دیگچی بیچ میں رکھی، ساتھ کولڈ ڈرنک اور دوسری طرف صرف پیاز کا سلاد۔ ہاسٹلرز کے لیے یہی بڑی عیاشی تھی۔

پہلا نوالہ لیتے ہوئے اس کا ہاتھ رکا۔

www.zemtime.com

کتنے سال ہو گئے تھے، گوشت اس کے منہ میں نہ گیا تھا۔ بڑا گوشت تو چلو کبھی بھی وہ کھاتی نہ تھی مگر چکن اور مٹن کے ذائقے میں فرق بھول گیا تھا۔ یا شاید ذائقہ ہی بھول گیا تھا۔ اسی دم ماں کے ہاتھ کی بھنی ہوئی دیسی مرغی کا ذائقہ اس کی زبان پہ اترا تو نوالہ زبان تک لیے جانا آسان ہوا۔ لیکن حلق سے اندر لے جانا آسان ثابت نہ ہوا۔

"کیا ہوا، اچھا نہیں بنا؟" حفصہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں..... اچھا بنا ہے۔" اس نے جلدی سے نوالہ نگلنے کی کوشش کی۔ اور حفصہ کا دل رکھنے کی بھی۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی زبان، اس کے حلق اور شاید اس کے معدے کو ابھی مشکل تھی اس ذائقے کو، اس کھانے کو قبول کرنے میں۔

حفصہ اس پہیلی جیسی لڑکی کو دیکھتی رہی جس کو کھانا مشکل لگ رہا تھا مگر اس کا دل رکھنے کو کھا رہی تھی۔ حفصہ اسے مشکل میں دیکھ نہ سکی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک دیا۔

"چھوڑ دو..... مت کھاؤ۔"

اس نے نظریں اٹھائیں، اس کی سیاہ آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ہم کچھ اور کھا لیں گے امتل۔" اس نے نرمی سے کہا۔

آنکھوں میں جمع پانی چھلکا اور اس کے گال بھگو گیا۔

"چلو آلو کے چپس بناتے ہیں۔ ساتھ پکوڑے بھی۔" حفصہ نے نرمی سے اس کے گال صاف کیے اور اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس رات وہ لڑکی حفصہ شاہد کے لیے پہیلی نہیں رہی تھی۔

"میں سننا چاہتی ہوں..... میں جاننا چاہتی ہوں۔ ایک امت الاحد درگا دیوی کیسے بنی۔" ٹوٹے تنے پہ بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہوئے حفصہ نے کہا تھا۔

اس نے حفصہ شاہد کی طرف دیکھا۔ اس کے دل نے کہا کہ سامنے بیٹھی یہ لڑکی کبھی اس کے دشمنوں میں سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے سامنے وہ اپنے ہونٹوں پہ لگی مہر ہٹا سکتی تھی۔

"ایک امت الاحد کبھی درگا دیوی نہیں بنی حفصہ..... ہاں ایک درگا دیوی امت الاحد بنی تھی۔"

☆☆☆

"میر واہ" چوہدری نگر سے بیس بائیس ایکڑ پرے بہنے والی وہ نہر تھی جو آج کل کی طرح کئی کئی ماہ پیاسی نہ رہتی تھی بلکہ ان دنوں قریباً پورا سال خود بھی سیراب رہتی اور ارد گرد کے باسیوں، زمینوں، مویشیوں اور دیگر جانداروں کی پیاس بھی دل کھول کر بجھاتی تھی۔ دریاؤں کی سی روانی کے ساتھ بہتی تھی۔ اسی کی لہروں نے ایک چمکیلی صبح کو پونے چار سال کی بچی کو اچھالا اور رحیمہ احمد کی گود میں ڈال دیا۔

رحیمہ احمد..... جن کی گود شادی کے سولہ سال بعد بھی سونی تھی۔ حالانکہ اسی گود میں انہوں نے اپنے دیوروں، نندوں کے بچے کلمہ سناتے ہوئے لوریاں دیتے ہوئے تھپک تھپک کر سلائے تھے لیکن جب ان کی مائیں ان کی گود یا پہلو سے اپنا سویا ہوا بچہ اٹھا کر لے جاتیں تو ان کے دل پر کیا بیتتی تھی یہ ان کا رب جانتا تھا، اور وہ خود یا چوہدری احمد یعقوب ان کے دکھ سکھ کے ساتھی۔

یوں تو بہت پیار کرنے والا، بے حد خیال رکھنے والا ہم سفر سنگ تھا، ہر نعمت میسر تھی۔ پھر وہ خود بھی صابرہ شاکرہ تھیں۔ پر عورت بھی کیا کرے جسے اپنا آپ مکمل ہی ماں بننے کے بعد لگتا ہے ورنہ ایک ادھورے پن کا احساس اندر ہی اندر کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ اور جب وہ بچی ان کی زندگی میں آئی تو یہ احساس کسی کونے کھدرے میں جا کر منہ چھپا کر سو گیا۔

ایک صبح چوہدری احمد یعقوب نے انہیں آ کر بتایا کہ انہیں نہر کے ایک کٹاؤ کے قریب جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی ایک بچی نیم مردہ حالت میں ملی ہے

www.zemtime.com

جسے وہ ڈسپنسری چھوڑ کر انہیں لینے آئے ہیں تو وہ فوراً اپنی چادر اوڑھ کر اس بچی کو دیکھنے پہنچ گئیں۔ بچی کے جسم سے پانی خارج کر کے اسے طبی امداد دے دی گئی تھی۔ ابھی وہ بے ہوشی کیے عالم میں تھی۔ اس کے نیلگوں جسم کو دیکھ کر ان کا دل لرز گیا۔ چوہدری احمد یعقوب کے کہنے پہ وہ مومنہ کا ایک فراک ساتھ لائی تھیں وہ اسے پہنا دیا۔ ڈسپنسر نے بتایا کہ بچی کو کوئی نشہ آور شے کافی مقدار میں کھلائی گئی ہے۔ اس کا معدہ تو مکمل طور پر صاف کر دیا گیا تھا لیکن جو اثر ہو چکا تھا وہ آٹھ گھنٹوں بعد ہی جا کر ختم ہوا۔ اس عرصہ میں رحیمہ احمد پل پل اس کی زندگی کے لیے دعا گو رہیں۔ آٹھ گھنٹے بعد جب اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو وہ "بسم اللہ" کہہ کر فوراً اس کے اوپر جھکیں۔ وہ ننھی سی جان خالی نظروں سے ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھتی رہی۔

وہ میاں بیوی ایک گھنٹے بعد اسے گھر لے آئے۔ سب بچے اسے دیکھتے ہی اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ سب کو یوں ہی دیکھتی رہی خالی خالی نظروں سے۔ ہاں چوہدری سلیمان یعقوب پہ نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ رحیمہ احمد نے اسے اپنی گود میں لے کر تھپکا۔ مگر وہ روتی رہی جب تک چوہدری سلیمان یعقوب اٹھ کر نہ چلے گئے۔ پھر روتے روتے ہی سو گئی تھی۔

"بھابی! مجھے لگتا ہے یہ تحفہ اللہ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔" ان کی چھوٹی نند یاسمین نے کہا۔

"نہیں یاسمین! جانے اس کی ماں اس کی جدائی میں کیسے تڑپ رہی ہو گی۔ اللہ نے اسے زندگی دی، اب اس کی ماں کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈالے۔" انہوں نے بچی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ بچی کچھ بولے، اپنا نام وغیرہ بتائے تو صبح شہر جا کر مساجد میں اعلان کرواؤں گا۔ اور تھانے بھی اطلاع دوں گا۔" چوہدری احمد یعقوب نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"بائی صاب! مسجدوں میں اعلان ضرور کروائیں لیکن تھانے والے کے چکروں میں بالکل نہ پڑیے گا۔" ان سے چھوٹے بھائی چوہدری حیدر یعقوب نے مشورہ دیا جس کی تائید باقی بھائیوں نے بھی کی۔

"چلو، دیکھتے ہیں۔ کیا حالات بنتے ہیں..... رحیمہ! اب تو سو گئی ہے یہ۔ جب بھی اٹھے، اسے کچھ کھلا پلا ضرور دینا۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس رات رحیمہ احمد کا پہلو بھرا بھرا اور آباد رہا۔ وہ ان سے چمٹ کر گہری نیند سوئی رہی جبکہ ان کی نیند بڑی کچی رہی۔ وہ چونک چونک کر اٹھتیں، کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہتیں اور پیار کر کے پھر آنکھیں موند لیتیں۔ دل میں جو خواہش آہستہ آہستہ سر ابھارنے لگی تھی، اسے اور یاسمین کے لفظوں کو بھی ساتھ تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتیں، لیکن ان کی کچی نیند کی طرح بار بار وہ خواہش بھی بیدار ہو جاتی اور یاسمین کے الفاظ بھی انگڑائیاں لینے لگتے۔

☆☆☆

رحیمہ احمد جھکیں، لال دہکتے ہوئے تندور کی دیوار سے سرعت کے ساتھ روٹی چپکائی اور ہاتھ باہر نکالتے ہوئے سیدھی ہو گئیں۔ ماتھے پہ چمکتے ہوئے قطروں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے نگاہ صحن میں دوڑتے بھاگتے بچوں پہ ڈالی۔ وہ ایک سفید رنگ کے چوزے کے پاس زمین کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت اشتیاق و استعجاب کے ساتھ اسے باجرے کی پلیٹ میں چونچ مارتے دیکھ رہی تھی۔ فاطمہ اس کے ساتھ بیٹھی اسے کچھ بتا رہی تھی۔

رحیمہ احمد نے مسکراتے ہوئے دوسرا پیڑا اٹھایا اور روٹی بنانے لگیں۔

بچوں کے ساتھ اس کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ وہ بھی تو اس کا سایہ بنے ہوئے تھے۔ یاسر، اسود، ہمایوں، رباب اور فاطمہ آج اس کی وجہ سے اسکول بھی نہ گئے تھے۔ اور اب ماؤں کی ڈانٹ کھانے کے باوجود تپتی دوپہر میں اسے لیے صحن میں

www.zemtime.com

موجود تھے کیونکہ ان کی ننھی مہمان چوزوں کو دیکھ کر ہی تو چارپائی سے اتری تھی۔

رحیمہ احمد کی نگاہ بھٹک بھٹک کر اس کی طرف ہی جا رہی تھی۔ یاسر نے ایک چوزہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ شاید ڈر رہی تھی۔

"یاسر! نہ کرو بیٹا!" انہوں نے ہاتھ پھر تندور میں لے جاتے ہوئے اسے منع کیا۔ پل بھر کے لیے ان کا بازو جو کہنی تک اندر جاتا تو تپتا تندور جیسے جھلسا کر رکھ دیتا۔ ان کے جھکے ہوئے چہرے پر بھی تپش یوں برس پڑتی کہ پورا چہرہ لال انگارہ ہو جاتا۔

"ماں ..... ماں..... امی۔" ہمایوں ان کی طرف بھاگتا ہوا آیا تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"امی! یاسر اسے چوزہ ہاتھ میں پکڑا رہا تھا تو اس نے کہا "ناں..... امی ککڑی مینا چک ہنے جاسی (یہ مرغی مجھے کاٹ لے گی)۔" وہ ہنس ہنس کر اس کی نقل اتار رہا تھا۔

"شکر ہے اللہ تیرا..... کچھ بولی تو سہی۔" رحیمہ احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب وہ اس چوزے پر ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے ہاتھ پھیر رہی تھی جسے یاسر نے پکڑ کر اس کے سامنے کیا ہوا تھا۔ باقی بچے اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ پھر بھی چوزہ ہاتھ میں لینے کی ہمت ابھی بھی اس میں نہ تھی۔

"جاؤ۔ اس سے پوچھو..... شاید اپنا نام بھی بتا دے۔" آسیہ نے کہا تو ہمایوں سر ہلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگ گیا۔

"کچھ لکڑیاں اور ڈالو۔" انہوں نے آسیہ سے کہا۔

تندور کو دہکائے رکھنے کے لیے اس کا پیٹ ساتھ ساتھ بھرنا پڑتا تھا۔

"ماں ..... امی۔۔ چاچی۔" بچے بھاگتے ہوئے ان کی طرف آئے۔ ہمایوں کے چہرے پہ اپنا ٹاسک پورا کر لینے کی خوشی تھی۔

"اس کا نام ہے دلگا دیوی۔"

بچی نے توتلی زبان میں جو اپنا نام بتایا بچے اسے دہرا رہے تھے۔ رحیمہ احمد کے ہاتھ پیڑا بناتے بناتے وہیں تھم گئے۔

"ہندوؤں کی بچی ہے۔" آسیہ نے تبصرہ کرتے ہوئے تندور میں باریک باریک چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ڈالیں۔

رحیمہ احمد نے دیکھا۔

لال انگارہ تندور منہ کھولے کسی خون آشام بلا کی طرح وہ لکڑیاں چبا رہا تھا اور انہیں راکھ کر دینے پہ تلا تھا۔

☆☆☆

"بے شک اللہ اس کو نہیں بخشتا جو اس کا شریک ٹھہرائے اور اس کے سوا جس کو چاہے بخش دے۔ اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے، اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔"

(سورہ نساء آیت 48)

"بے شک جو اللہ کا شریک ٹھہرائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔ اور اس کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہا گا"

(سورہ المائدہ آیت 72 کا کچھ حصہ)

یقیناً اللہ غفور ہے اور رحیم بھی۔ اس کی بخشش اس کی رحمتوں کا کوئی شمار نہیں ہر ایک مشرک کو واضح لفظوں میں خبردار کر دیا گیا ہے کہ وہ نہیں بخشا جائے گا۔ اس کا دائمی ٹھکانہ دوزخ ہی ہوگا۔

رحیمہ احمد نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا تو بچی کا معصوم سا چہرہ نگاہوں کے عین سامنے آ گیا انہوں نے اس کے ایک ایک سلونے نقش کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے چھوا۔

"روز محشر یہ چہرہ ایک مشرک کا چہرا ہوگا، جنت جس پر حرام ہوگی۔"

اپنے خیالات کو جھٹکتے ہوئے وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔ آج کچی نیند نے بھی دغا دے دی اور پلکوں سے پرے ہو کے بیٹھ گئی

www.zemtime.com

تھی۔انہوں نے پھر اس پر نگاہیں ٹکا دیں۔وہ گہری نیند سو رہی تھی اس کے لبوں پہ دھیمی سی مسکان یوں سجی ہوئی تھی جیسے خوابوں ہی خوابوں میں جنت کے باغات کی سیر کر رہی ہو۔

کیا یہ معصوم سی پری باطل خداؤں کو مانتے ہوئے عمر گزارے گی پھر اس دائمی زندگی میں جہنم کے عذاب چکھے گی۔

"نہیں.....نہیں۔" تڑپ کر یہ گردان کرتے ہوئے اس پہ جھکیں۔اس کو پیار کر کے پھر اس کے برابر لیٹ گئیں اور کروٹ پہ کروٹ بدلنے لگیں۔وہ کوئی فجر سے گھنٹہ پہلے کا وقت تھا جب ان کی آنکھ پھر لگی۔

وہ ایک دہکتا ہوا لال انگارہ تندور تھا جس میں ایندھن ڈالا جا رہا تھا مگر اس کی پیٹ تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔اب کے اس کی بھوک مٹانے کے لیے جو لکڑی ڈالی گئی۔وہ.....وہ لکڑی تو نہیں تھی۔انہوں نے جھک کر اس میں جھانکا۔وہ.....وہ تو درگا دیوی تھی۔

"نہیں.....نہیں۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔سارا دن جو سوچیں جو خیال انہوں نے دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی، وہ بھیانک خواب کی صورت سامنے آ گئے۔ان کی سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔

"کیا ہوا رحیمہ؟" سامنے والے پلنگ پر سوئے چوہدری احمد یعقوب اٹھ کر بیٹھ گئے۔وہ تیزی سے اپنے پلنگ سے اتر کر ان کے پلنگ کی طرف آئیں اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں اسے نار جہنم کا ایندھن نہیں بننے دوں گی۔" آنسو ان کے رخسار بھگو رہے تھے۔چوہدری احمد یعقوب کچھ سمجھ نہ پائے۔

"میں اسے نہیں جانے دوں گی، میں اسے نہیں جانے دوں گی۔"

اب کے وہ سمجھے تھے۔انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑا کر ان کے چہرے سے آنسو پونچھے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا رحیمہ.....ہم کسی ماں کی گود خالی کیسے کر سکتے ہیں۔ایک باپ سے اس کے جگر کا ٹکڑا کیسے چھین سکتے ہیں۔"

"میں کر لوں گی یہ ظلم.....میں کر لوں گی۔" وہ تیزی سے سر ہلا رہی تھیں۔"اسے اگلی دنیا کے عذاب سے بچانے کے لیے میں اس دنیا میں یہ جرم کر لوں گی۔دیکھیں۔ادھر دیکھیں.....یہ تندور میں روٹی لگاتے ہوئے پرسوں میرا بازو اس سے ٹکرایا تھا" انہوں نے اپنا بازو سامنے کیا۔دودھیا بازو پر لال نشان چمک رہا تھا۔آبلہ پھٹ چکا تھا اور نشان سیاہی میں بدل رہا تھا۔

"اتنی تکلیف ہوئی تھی، اتنی کہ بتا نہیں سکتی.....یہ بس اتنا سا حصہ.....اس کا تو سارا بدن.....وہ بھی ہمیشہ کے لیے.....نہیں۔نہیں۔"

آنسو اور ہچکیاں انہیں جملہ مکمل کرنے نہیں دے رہے تھے۔یہ بے ربط ادھورے الفاظ سن کر بھی چوہدری احمد یعقوب دہل گئے۔

"یاسمین ٹھیک کہتی ہے۔اسے اللہ نے ہماری جھولی میں ڈالا ہے۔

آج تک آپ نے جو کچھ بھی مجھے دیا یا جو کچھ بھی میرے لیے کیا، اپنی مرضی سے۔پر آج میں خود آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں.....کیا آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کریں گے۔"

وہ عورت چوہدری احمد یعقوب کے سامنے تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی، پہلی بار کچھ مانگ رہی تھی۔جو ان کے لیے بہترین متاع تھی۔

وہ کیسے نہ مانتے؟

☆☆☆

وہ درگا دیوی سے امت الاحد بن گئی۔ایک دیوی سے ایک امتل (بندی، کنیز)

رحیمہ احمد ہمیشہ سوچتی تھیں کہ اللہ انہیں بیٹی جیسی رحمت سے نوازے گا تو وہ اس کا نام یہ رکھیں گی وہ رکھیں گی۔لیکن اس کے لیے انہیں نام چننا نہیں پڑا۔سوچنا نہیں پڑا بلکہ فوراً ہی فیصلہ ہو گیا کہ وہ اس کا نام امت الاحد رکھیں گی۔

www.zemtime.com

احد جو اسم باری تعالیٰ ہے جس کے معانی ہیں۔ایک، اکیلا، The One۔

امت الاحد یعنی ایک اللہ کی کنیز۔ایک اللہ کو ماننے والی بندی۔

یوں توحید کا سبق اس کو دی جانے والی ہر پکار میں شامل ہو گیا۔

رحیمہ احمد اسے کلمہ طیبہ کی لوری دے کر سلاتیں اور کلمہ شہادت کی ندا دے کر جگاتیں۔

اس کے حافظے میں چار پونے چار سال تک کی جو یادیں تھیں، وہ سال بھر تک اس کے ساتھ رہیں۔کبھی وہ ماں یا کسی چاچی کو ممی کہہ کر پکارتی کبھی گوشت دیکھ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیتی۔اور چھوٹے چاچو سفیان کو تو اکثر وہ ''بھاؤ'' کہہ جاتی، اور سفیان کو اتنا اچھا لگتا کہ وہ مستقل اس کے بھاؤ ہی بن گئے۔

پھر دھیرے دھیرے وہ یادیں اس کے ننھے ذہن سے محو ہوتی گئیں اور وہ اس گھر کے آج میں جینے لگی جہاں وہ ہر پل محبتوں اور چاہتوں کی پھوار میں بھیگتی۔بس ایک آسیہ چاچی تھیں جن کا رویہ دھوپ چھاؤں سا تھا۔کبھی مہربان اور کبھی حد درجہ سرد اور بے نیاز۔اور ایک وہ چاچو سلیمان تھے، جن سے اسے ڈر لگتا تھا۔پھر آہستہ آہستہ یہ ڈر بھی ختم ہوتا گیا۔وہ تو بہت اچھے تھے، کم بات کرتے تھے، جلدی غصہ بھی کرتے تھے مگر اس پہ کبھی غصہ نہ کیا۔آہستہ آہستہ اسے پتا چلا کہ اسے ان سے ڈر نہیں لگتا تھا بلکہ ان کی کالی گھنی مونچھوں سے ڈر لگتا تھا۔

رحیمہ احمد اور چوہدری احمد یعقوب کے خاندان کے بعض افراد نے ان کے اس فیصلے کی مخالفت بھی کی تو چوہدری احمد یعقوب نے سب کو سمجھا لیا۔بس نہ سمجھا سکے تو اپنی بڑی بہن آپا فردوس کو جن کا رویہ امت الاحد کے ساتھ بہت حقارت بھرا ہوتا۔

کوئی بیمار پڑ جاتا تو کہتیں۔''ہندوؤں کی بچی رکھی ہے بیماریاں تو رستہ دیکھیں گی۔''

کبھی کوئی فصل اچھی نہ ہوتی تو بولتیں۔''مشرکوں کی اولاد پال رہے ہو، برکت کہاں رہے گی۔''

وہ کبھی بھی اسے اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے قبول نہ کر پائیں۔اپنے بچوں کو بھی اس کے ساتھ گھلنے ملنے، اس کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتیں۔یہ اور بات کہ اس عمر میں بچے ایسی ہدایات سنتے اور مانتے کب ہیں۔

رحیمہ احمد حتی المقدور کوشش کرتیں کہ امت الاحد آپا فردوس کے سامنے کم ہی جائے، خواہ مخواہ کی بدمزگی ہو جاتی اور بچی سہم سی جاتی۔لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ رہتی بھی تو دیوار پار تھیں، اس لیے ہر وقت کا آنا جانا لگا رہتا۔ایسی احتیاطیں، ایسی پیش بندیاں کہاں تک چلتیں۔آہستہ آہستہ امتل بھی ان کے اس سلوک کی عادی ہو گئی۔

رحیمہ احمد سادہ سی خاتون تھیں۔نیک نیت تھیں سلجھی طبیعت کی مالک تھیں۔گو زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن جتنا علم تھا، اتنا عمل بھی تھا۔دو چہرے نہ رکھتی تھیں۔ان کے نزدیک دین سادہ اور آسان تھا۔جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کوئی حکم پڑھ لیتیں، سادگی کے ساتھ اس پہ عمل پیرا ہو جاتیں۔عالمہ نہ تھیں مگر امتل کے لیے باریکی سے اسلام کا مطالعہ کیا اور ان ہی خطوط پر اس کی تربیت کرنے لگیں۔وہ اس معاملے میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہ کرتیں بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اور اپنے عمل سے بہت کچھ سکھا دیتیں۔

ان کے گھر کا ماحول بھی سادہ اور مہذب تھا۔بڑوں میں محبت اور یگانگت تھی، ایک دوسرے کا ادب و لحاظ تھا۔دیورانی جٹھانی میں کسی بات پہ کوئی رنجش ہو بھی جاتی تو اس وقتی خفگی کا دورانیہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوتا۔اگلے پہر پھر ایک ہی چارپائی پہ بیٹھ کر ساگ کاٹتے ہوئے، مٹر کے دانے نکالتے ہوئے، دوپٹے پہ بیل کاڑھتے ہوئے، یا اون سلائیوں میں الجھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں یوں مگن ہوتیں جیسے پچھلے پہر ان کی ان بن

www.zemtime.com

تو کوئی خواب ہی تھا۔

بچے بھی ایسے کہ جن کا گزارہ ایک دوسرے کے بغیر نہ ہوتا۔ اکٹھے کھیلنا، اسکول جانا، کھانا پینا، سب ایک ساتھ۔ ان کی ماؤں کے تعلقات آپس میں کیسے بھی ہو جاتے، ان کے تعلقات میں فرق نہ آتا۔ یہ بچے شرارتی تھے مگر بدتمیز ہرگز نہیں۔ اور اس کا تو خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ اس لیے امتل کو ان کے بیچ اور ان کے دل میں جگہ بنانے میں بالکل وقت نہ لگا۔ یوں ہی بڑے سارے صحن میں ان کے ساتھ برف پانی کھیلتے، موٹر سائیکل پہ بابا کے پیچھے بیٹھ کر صحن میں چکر لیتے، چوزوں اور لیلوں کے پیچھے بھاگتے، بابا سے فرمائشیں کرتے، ماں کے بازو پر سر رکھ کر پیارے نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے قصے سنتے ہوئے وہ بڑی ہوتی گئی۔ وقت اسی مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی متوازن چال چلتا رہا۔ چوہدری احمد یعقوب، رحیمہ احمد اور امت الاحد کی مثلث ایک مکمل کائنات بن گئی تھی۔

☆☆☆

"چلو بابا چلو..... بلاک کے اندر چلو۔ بہت رات ہوگئی۔ میں نے تالا لگانا ہے۔" اے بلاک کی گرل کے پاس کھڑے قاسم بابا اپنی پاٹ دار آواز میں لڑکیوں کو بلا رہے تھے۔

"اوہو..... یہ قاسم بابا بھی ناں..... اس وقت ہی انہیں ساری ڈیوٹی نبھانی یاد آتی ہے۔" حفصہ نے قاسم بابا کو گھورتے ہوئے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

دو بج رہے تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی جو اب محسوس ہوئی تھی۔

"چلو چلتے ہیں روم میں۔۔۔ تم آج میرے پاس ہی رک جاؤ۔" حفصہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... شاید پری آگئی ہو۔"

وہ چاہنے کے باوجود حفصہ کے کمرے میں رک نہ سکتی تھی۔ پورنیما رات باہر کہاں گزارتی ہے، اس بات کے لیے وہ امتل کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ مگر وہ رات کہاں رہی، اس کے لیے پورنیما کو جواب نہ بھی دیتی تو بھی بھاؤ کو ثابت کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ رات ہاسٹل میں ہی تھی۔

"اچھا..... چلو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو، ہمیں پھر ملنا ہے بلکہ کل ہی ملنا ہے۔ ابھی داستاں ادھوری ہے۔"

امتل نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ اور دونوں زینوں کی طرف آگئیں۔ لیکن حفصہ نے ان سے اترنے کے بجائے جہاں نسبتاً کم اونچائی تھی، وہاں سے چھلانگ لگائی اور گرتے گرتے بچی۔

"ایک تو اس لڑکی کو میں نے کبھی سکون میں نہیں دیکھا۔ نہ زبان کو سکون دیتی ہے نہ خود کو۔"

قاسم بابا کی عزت افزائی پہ وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور آخری زینے پہ کھڑی امتل کی طرف آگئی۔

"سنو۔" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب ہم اجنبی تو نہیں ہیں ناں۔"

وہ ذرا سا مسکرائی۔

"آدھی آدھی رات تک جاگتی ہو۔ صبح کو پڑھتی کیا خاک ہوگی۔" اب چار لڑکیوں کا ایک ٹولہ قاسم بابا سے ڈانٹ سن رہا تھا، لیکن اثر کس کو ہونے والا تھا۔

"اور تم بابا، دوسرے بلاک کی لڑکیاں..... چلو اپنے اپنے بلاک میں۔ میں نے کسی کا انتظار نہیں کرنا اور تالا لگا دینا ہے۔ پھر بھلے چیختی رہنا۔"

لڑکیوں کو دھمکی ملی تو حفصہ اسے گڈ نائٹ کہتے ہوئے اپنے بلاک کی لڑکی کے ساتھ چل پڑی۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے پھر مڑ کر اس کی پشت پہ نظر ڈالی۔

اس نے کبھی کوئی دوست نہ بنائی تھی۔ اس نے کبھی اپنے لیے کسی نئے رشتے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ لیکن اس پرخلوص لڑکی سے مل کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک اچھا دوست زندگی میں کس قدر ضروری ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

www.zemtime.com